سوانح درخشاں

داستان تحمل حفیظ



از قلم

احمد مشاہد حفیظ صدیقی

بیت عزیز، گلبرگہ شریف



سوانح درخشاں

داستانِ تحمُّلِ حفیظ



از قلم

احمد مشاہد حفیظ صدیقی

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَلَمِیْنَ اَلصَّلوٰۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُولِ الْکَرِیْم اَمَّا بَعَدُ

رَبِّ اَوزِعنِی اَن اَشکُرَ نِعمَتَکَ الَّتِی اَنعَمتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَن اَعمَلَ صَالِحًا تَرضٰهُ وَاَصلِح لِی فِی ذُرِّیَّتِی اِنِّی تُبتُ اِلَیکَ وَاِنِّی مِنَ المُسلِمِینَ

(سورة الأحقاف ۱۵)

اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے اور تو میری اولاد کو بھی صالح بنا۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (سورة الإسراء ۲۴)

اے میرے رب! میرے والدین پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ(سورة إبراهيم ۴۱)

اے میرے رب! مجھے، میرے والدین کو اور تمام مؤمنوں کو حساب قائم ہونے کے دن بخش دے

باپ وہ نسیمِ سحر، وہ گلستانِ وقار،
جس کے دم سے مہک اٹھے ہر آرزو، ہر دیار،
وہ سکونِ دلِ مضطر، وہ سرورِ پائیدار،
جس کی شفقت سے روشن ہر منزلِ کردار۔

وہ شبِ ہجر میں اولاد کی خاطر بیدار،
دل میں اندیشہ مگر لب پہ تبسم کی بہار،
ہر قدم پر وہی فکر و محبت کا حصار،
جیسے صحرا میں کسی چشمہِ راحت کا نکھار۔

حرفِ آغاز

دنیا کے ناممکن کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ والدین کا احسان ادا کرنے کے متعلق سوچا بھی جائے۔ مقامِ والدین کا تصور بھی دائرہِ عقل سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں حکمِ ایراضِ لفظ ''اُف'' سے انسانیت کو والدین کے مقامِ عالیٰ کا اشارہ فرمایا ہے۔ یہ توفیقِ ربانی اور ہدایتِ رحمانی ہے کہ اولاد اپنے والدین کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نایاب نعمت اور خوش نصیبی سمجھ کر قبول کرے ورنہ اس جہاں میں چلتے پھرتے نالائق بوجھ بھی بیحد ہیں۔

میں جس گلشن کا بے رنگ پھول ہوں اس باغ کی رونق بلاشبہ میرے والدین سے ہی ہے۔ مٹھاسِ شفقت میں دونوں لاجواب، معطر ایسے کہ مجھ کانٹے سے بھی اُن کی مہک پھیلتی ہے، خوشنما مزاجِ عالیٰ کا نور اُن کے روشن سائے سے چمکتا ہے، ایک سخاوت کے بادشاہ ہیں تو دوسرے ہمدردی کی ملکہ تھیں، میرے والدین میری کائنات کے روشن آفتاب اور پرنور ماہتاب ہیں۔ جس ذمہ داری اور مشقت سے ہر ایک قدم پر دھیان کے ساتھ میری تربیت اور تعلیم کا کارنامہ انجام فرمایا، آج میرے لیے یہ سخت مشکل گھڑی ہے کہ میں اُنکی شان

کے مطابق اُن کیلئے الفاظ کا گلدستہ سجاوں۔تمنا کے ساتھ کوشش یہ ہے کے اپنے والد بزرگوار کی حیاتِ مبارکہ کے نایاب جوہرات سے اس مقالہ کوعروج حاصل ہواور یہ تحریرمرحومہ والدہ ماجدہ کے روحِ انور کے لئے باعثِ مسرت اورتسکین بنے۔اس کار میں یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے لڑکھڑاتے قلم کی رہنمائی فرمائے،آمین۔

ہر انسان کی پہچان اس کے والدِ گرامی سے ہوتی ہےاور جیسے کہ ارشادِ نبی ﷺ ہے کہ جنت کے رونق بابوں میں سے''والد'' کا وجودِمبارک ایک پرُنور نایاب باب ہے،لہاذا جنت کے اپنے مقدس باب کوسجانے اور چمکانے کی میری یہ ایک آرزو جاگی۔ادِاحق سے تو بہت دور، یہ کاوشِ ادنیٰ ہے کہ ایک عظیم شخصیت کے حیاتِ مبارکہ کا نقشہ کھینچوں۔سینکڑوں اوراخ سے بھی تعریف مکمل نہیں ہوسکتی ، یہ مہذا ایک کاوشِ ذوق ہے کہ کچھ الفاظ کوترتیب دے کر میں اپنی حیثیت کے مطابق ادبی سلام پیش کروں۔امید ہے کہ میرے داغدار اخلاق کا مجسمہ اور بے غیرت کردار،اس تحریر کے طفیل پاکی حاصل کر سکے،میرے سیاہ وجود کونور بخشے اورآخرت میں حفاظتِ نار کا سبب بن جائے۔اللہ تعالی سے امید ہے کہ اس انشاء کے بائس،محررِاحقر کو بابِ فردوس سے مرحبا کی شیریں صدا سنائی دے،آمین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ سَّمِیُعُ الْعَلِیُم

۴،جون ۲۰۲۶ءم ۱۷،ذوالحجہ۱۴۴۷ھ،بروزِ چہارشنبہ،بمقام گہ شریف

ولادت باسعادت

سنہ ۱۹۴۱ء کی ۱۲ دسمبر، مطابق ۸ ذوالحجہ ۱۳۶۲ھ، بروز جمعہ المبارک، وہ سعید و مسعود ساعت تھی جب مشیتِ خداوند نے شہرِ بُرہان پور، تعالقہ اکلکوٹ میں جناب حضرت محمد منظور الحق صدیقی صاحب اور محترمہ رحمٰن بیگم صاحبہ کے آغوشِ تربیت میں چوتھے فرزند کی صورت میں ایک ایسے گوہرِ نایاب کو عالمِ وجود میں جلوہ گر فرمایا، جس کی ولادت محض ایک خاندانی اضافہ نہ تھی بلکہ تقدیرِ الٰہی کے ایک عظیم الشان باب کا افتتاح تھی۔

جناب محترم المقام الحاج قاضی محمد حفیظ الحسن صدیقی المعروف شاھد صدیقی مدظلہ علٰی (میرے والد بزرگوار) وہ مبارک ہستی ہیں جن کے وجودِ مسعود کو ربِّ ذوالجلال نے اپنی بے شمار رحمتوں، فیوض و برکات اور الطافِ خفیہ کے ظہور کا وسیلہ بنایا۔ اُن کی پیدائش محض ایک فرد کا دنیا میں آنا نہ تھا بلکہ آنے والی نسلوں کے مقدرات میں نور، وقار اور سعادت کے نقوش ثبت ہونے کا نقطہ آغاز تھا۔ مراسلہ نگار (یعنی خاک سار) اپنی ہستی، اپنی شناخت اور اپنے وجود کے تمام تر معانی کو اسی ذاتِ گرامی کے طفیل ایک عطیہ ربانی تصور کرتا ہے۔ اگر قدرتِ الٰہی اس مبارک وجود کو سببِ وجود نہ بناتی تو میری حیات کا چراغ بھی کبھی روشن نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ نے انہیں

محض ایک انسان کے طور پر نہیں بلکہ اپنی حکمتوں، عنایتوں اور بے شمار فضل و کرم کے مظہر و وسیلہ کے طور پر منتخب فرمایا، تاکہ ان کے توسط سے خاندان، اولاد اور متعلقین پر خیر و برکت کے انوار مسلسل نازل ہوتے رہیں۔

خاندان وسلسلہ نسب

جناب محترم المقام الحاج قاضی محمد حفیظ الحسن صدیقی المعروف شاھد صدیقی مدظلہ علیٰ مبارک اور بابرکت خاندانِ صدیقی کے روشن چراغوں میں ایک پرنور اور رونق افروض شخصیت ہیں۔ آپکے والد بزرگوار محترم جناب الحاج محمد منظور الحق صدیقی صاحب مرحوم برادر قاضی گلبرگہ اور اپنے زمانے کے بڑے معزز اور شفیق شخصیت تھے۔ ہمارے خاندان کے زیرِ اِلتفات موجود شجرہِ اَنساب ومعطیاتِ نسبیاتی کے استنادی وتحقیقی اندراجات کی روشنی میں، آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے......

الحاج قاضی محمد حفیظ الحسن صدیقی المعروف شاھد صدیقی **ولد** محترم جناب الحاج محمد منظور الحق صدیقی صاحب **ولد** خادم الشرع حضرت الحاج قاضی محمد حسین صدیقی ثانی (قاضی ششم) **ولد** خادم الشرع حضرت قاضی محمد رحمت اللہ صدیقی ثانی (قاضی پنجم) **ولد** خادم الشرع حضرت قاضی محمد امیر الدین صدیقی (قاضی چہارم) **ولد** خادم الشرع حضرت قاضی محمد حسین صدیقی اول (قاضی سوم) **ولد** خادم الشرع حضرت قاضی محمد رحمت اللہ صدیقی اول (قاضی دوم) **ولد** خادم الشرع حضرت قاضی محمد عبدالقادر صدیقی (قاضی اول گلبرگہ) **ولد** خادم الشرع حضرت

قاضی محمد ولی اللہ صدیقی (قاضی بلگاؤں) ولد حضرت شیخ محمد نہال اللہ عرف شیخ چمن صدیقی ولد حضرت خواجہ خوند میر نقشبند صدیقی ولد حضرت دانیال عرف دیان الدین ولد حضرت محمد ولی اللہ ولد حضرت برہان الدین ولد حضرت محمد میاں ولد حضرت سلطان والا ولد حضرت مولانا جلال الدین رومی البلخی المعروف مولانا روم ولد حضرت بہاوالدین محمد والانقشبندی ولد حضرت الشیخ الحسین ولد حضرت احمد الخطی الکبری ولد حضرت الشیخ الحسین ولد حضرت ابوالنصر ولد حضرت قاسم ولد حضرت ابوالنصر ولد تبع التابعی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ولد التابعی المحد ث الامام حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ولد التابعی المحد ث الامام حضرت قاسم رضی اللہ عنہ ولد صحابیِ رسول حضرت محمد رضی اللہ عنہ ولد خلیفہِ اوّل، یارِ غار، امامُ المتقین، امیرُ المؤمنین، سیّدُ الصدّیقین، افضلُ البشر بعد الانبیاء، ثانیٔ اثنین، محبوبِ رسول، جانثارِ مصطفیٰ، تاجدارِ صداقت، معدنِ ایقان، مرجعِ صحابہ، سابقُ الاسلام، جامعُ القرآن، زینتِ خلافت، فخرِ صحابیت، محسنِ اُمت، مقتدائے اہلِ ایمان، مظہرِ اخلاص، پاسبانِ شریعت، تاجِ خلافتِ راشدہ، محبوبِ بارگاہِ نبوی، وارثِ علومِ نبوت، شمشیرِ حق، گلزارِ وفاداری، مرکزِ یقین، سلطانُ الصحابہ، امامُ الزاہدین، مرقعِ عشقِ رسول، پیکرِ حلم وحیا، اسوہِ صدق وصفا، شمعِ بزمِ صحابیت، آفتابِ خلافت، ماہتابِ صداقت، چراغِ ہدایت، ترجمانِ حق،

سَیِّدُنَا اَبُوْ بَکْرُ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

وطنِ رہائش

حضرت والدِ گرامی کی اصل سکونت گاہ اور اُن کی خاندانی وابستگیوں کا مرکز وہ عظیم و باوقار آبائی مکان تھا جسے شریعت محل کے نام سے جانا جاتا تھا، جو کہ تاریخی قلع حشام گلبرگہ شریف میں واقع ہے۔ یہ محض ایک رہائشی مکان نہ تھا بلکہ نسلوں کی یادوں، خاندانی روایات، تہذیبی وقار، اور گزرے ہوئے ادوار کی خاموش داستانوں کا ایک زندہ استعارہ محسوس ہوتا تھا۔

شریعت محل کی ہر در و دیوار، ہر دالان، اور ہر گوشہ گویا اپنے اندر ایک مستقل تاریخ سموئے ہوئے تھا۔ اُس مکان کی فضا میں بزرگوں کی دعاؤں کی تاثیر، خاندانی نشستوں کی گونج، بچپن کی شوخیوں کی بازگشت، اور زمانے کے بے شمار نشیب و فراز کی خاموش یادیں رچی بسی محسوس ہوتی تھیں۔ گویا وہ مکان صرف اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر شدہ عمارت نہ تھا بلکہ ایک مکمل خاندانی تہذیب، ایک عظیم ورثہ، اور کئی نسلوں کی جذباتی وابستگیوں کا امین تھا۔

حضرت والدِ گرامی اگرچہ اپنی والدہ ماجدہ کے گھر برہان پور میں پیدا ہوئے، لیکن ولادت کے بعد وہ اپنے والدِ محترم کے ہمراہ مستقل طور پر گلبرگہ تشریف لائے، اور پھر یہی شہر، یہی قلعہ، اور



شریعت محل کی ایک تاریخی تصویر جس میں بیچ میں جناب قاضی محمد حسین صدیقی (ثانی) جو کہ محترم والد
صاحب کے دادا حضرت، اپنے اولاد اور ذریت کے ہمراہ تشریف فرما ہیں۔

یہی شریعت محل اُن کی پوری زندگی کا مرکز بن گیا۔یہیں اُنھوں نے اپنے بچپن کی معصوم ساعتیں گزاریں، یہیں اُن کی ابتدائی تربیت کا ماحول بنا، یہیں اُنھوں نے خاندانی محبتوں، آزمائشوں، جدائیوں اور خوشیوں کو قریب سے محسوس کیا، اور یہی مقام اُن کی شخصیت کی فکری، جذباتی اور تہذیبی تشکیل کا بنیادی سرچشمہ ثابت ہوا۔

شریعت محل دراصل حضرت والدِ محترم کے لیے صرف ایک گھر نہ تھا بلکہ اُن کی شناخت، اُن کی یادوں، اُن کے ماضی، اور اُن کی خاندانی عظمت کا ایک ناقابلِ جدا حصہ تھا۔ اُس تاریخی مکان کی فضا میں اُن کے بچپن کی شوخیاں، برادرانِ اکابر کی شفقت، والدہ ماجدہ کی محبت، خاندان کی خوشیاں، اور بعد کے زمانوں کی بے شمار تلخ و شیریں یادیں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئیں۔

یوں کہا جاسکتا ہے کہ حضرت والدِ گرامی کی پوری حیات کی ابتدائی داستان شریعت محل کے انہی تاریخی سایوں، تہذیبی فضاؤں، اور خاندانی روایات کے زیرِ اثر پروان چڑھی، اور یہی مکان اُن کی زندگی کی اولین درسگاہ، جذباتی پناہ گاہ، اور خاندانی عظمت کی علامت بن کر ہمیشہ اُن کے ساتھ وابستہ رہا۔

عہدِ طفولیت

حضرت والدِ گرامی کا عہدِ طفولیت فرحت و شادمانی، شفقت و محبت، اور پاکیزہ خاندانی روایات کا ایک نہایت دلآویز مرقع تھا۔ان کے تینوں برادرانِ اکابراُن کے لیے محض بھائی نہ تھے بلکہ سراپا شفقت، پیکرِ ایثار اور مجسم کرم و مروّت تھے، جن کی آغوشِ محبت میں اُن کی ابتدائی زندگی نہایت اطمینان، دلنوازی اور بےفکری کے ساتھ پروان چڑھی۔ گھر کا ماحول تہذیبِ نفیس، اخلاقی وقار اور باہمی الفت و مودّت کے ایسے خوشگوار امتزاج سے معمور تھا کہ ہر گوشہ مسرتوں کی کہکشاں اور ہر لمحہ محبتوں کی عطر بیز فضا معلوم ہوتا تھا۔

طفولیت کی شوخیاں، معصومانہ شرارتیں، کھلکھلاہٹوں کی مترنم بازگشت اور اہلِ خانہ کی دلآویز دلجوئیاں اُس خانوادۂ سعادت کے در و دیوار کو ایک زندہ جاوید نشاط گاہ بنائے ہوئے تھیں۔ وہ گھر محض اینٹ کی تعمیر نہ تھا بلکہ باہمی احترام، خلوص، وضع داری اور خاندانی شرافت کا ایک باوقار دبستان تھا جہاں محبت، نظم و ضبط اور اخلاقی اقدار باہم اس طرح شیر و شکر تھے کہ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ایک شاہانہ مگر مہذب انداز میں رواں دواں دکھائی دیتی تھی۔ حضرت والدِ محترم اپنے والدینِ ماجدین کی آنکھوں کا نور، قلب کا سرور اور امیدوں کا

محور تھے۔ اُن کی ہر ادا باعثِ تسکین، اُن کی ہر مسکراہٹ موجبِ انبساط، اور اُن کی ہر معصوم خواہش اہلِ خانہ کے لیے سرمایہ مسرت ہوا کرتی تھی۔ والدین کی نگاہِ شفقت اُن پر اس درجہ سایہ فگن رہتی کہ گویا وہ خاندان کے گلستان کا سب سے نازک، معطر اور محبوب پھول ہوں، جس کی آبیاری محبت، دعا اور توجہ کے آبِ زریں سے کی جا رہی ہو۔



چھوٹے (معظم) تایا ابا صاحب، محترم والد صاحب اور بڑے (فاروق) تایا ابا صاحب

برادرانہ شفقت

محترم والدِ گرامی صاحب جب اس جہانِ رنگ و بو میں جلوہ گر ہوئے تو قدرتِ الٰہی نے اُنہیں ایک ایسے معزز، باوقار اور محبتوں سے معمور خانوادے میں جگہ عطا فرمائی جہاں اُن کے استقبال کے لیے تین برادرانِ اکابر پہلے ہی موجود تھے۔ یہ حضرات نہ صرف نسبی اعتبار سے اُن کے بڑے بھائی تھے بلکہ اُن کی شخصیت کی تعمیر، تربیت، رہنمائی اور جذباتی استحکام کے بنیادی ستون بھی تھے۔

اُن میں سب سے بڑے بھائی جناب فضل محمد حبیب الرحمٰن صدیقی المعروف فاروق صاحب (میرے بڑے تایا) تھے، جن کی شخصیت سنجیدگی، دور اندیشی، ایثار اور خاندانی وقار کا حسین مرقع تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے محض ایک بڑے بھائی نہ تھے بلکہ ایک مشفق مربی، مدبر سرپرست اور والدانہ شفقت رکھنے والی ہستی کی حیثیت رکھتے تھے۔

دوسرے نمبر پر جناب محمد مرغوب الحق صدیقی المعروف معظم صاحب (میرے چھوٹے تایا) ہیں، جن کی شخصیت خلوص، وضع داری، محبت اور خاندانی وابستگی کی دلآویز مثال سمجھی جاتی تھی۔

اُن کے مزاج میں شفقت، نرمی اور اپنائیت کی ایسی کیفیت پائی جاتی تھی جس نے خاندان کے ماحول کو ہمیشہ باہمی محبت اور انسیت سے معمور رکھا۔

تیسرے برادرِ محترم جناب محمد مظفر الحق صدیقی المعروف ظفر صاحب (ظفر تایا) تھے، جن کی شخصیت ایک نہایت روشن، جذباتی اور ناقابلِ فراموش باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی شخصیت میں برادرانہ محبت، ایثار، ذہانت اور رفاقت کا ایسا حسین امتزاج موجود تھا کہ وہ صرف بھائی ہی نہیں بلکہ رازدار، ہم سفر، محافظ اور مخلص ترین رفیق کی صورت اختیار کرتے تھے۔

یوں حضرت والدِ گرامی کی ولادت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں اُنہیں ابتدا ہی سے برادرانہ شفقت، خاندانی وقار، اخلاقی تربیت اور محبتوں سے لبریز ماحول میسر آیا۔ یہی وہ مبارک رشتے تھے جنہوں نے اُن کی شخصیت کی بنیادوں کو استحکام بخشا اور اُنہیں حیات کے دشوار ترین مراحل میں بھی حوصلہ، وقار اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھنے کا سلیقہ عطا کیا۔

ہمشیرگان، آمد و رحلت

قدرتِ خداوند کا یہ اٹل دستور رہا ہے کہ اُس نے دارِفانی کی حیات کو آزمائشوں، ابتلاؤں اور نشیب وفراز کے امتزاج سے مزین فرمایا ہے۔ بندہِ مومن کی نگاہ اگرچہ بسا اوقات حوادثِ زمانہ کی تلخیوں سے مضطرب ہو اٹھتی ہے، لیکن حقیقتِ امر یہی ہے کہ مشیتِ ربانی کے ہر فیصلے میں پنہاں حکمتیں اور مخفی رحمتیں کارفرما ہوتی ہیں، خواہ انسانی قلب اُن کی شدتِ اثر کے باعث فوری طور پر اُنہیں قبول کرنے سے قاصر ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خانوادہ سعادت کی وہ پُرمسرت فضا، جو ہنسی، شادمانی اور راحتِ قلب کا گہوارہ تھی، رفتہ رفتہ آزمائش کے دبیز سائے اپنے دامن میں لینے لگی۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں حضرت والدِ گرامی کے بعد پیدا ہونے والی جڑواں ہمشیرگان، عسمت اور نظہت جو اہلِ خانہ کی امیدوں، تمناؤں اور محبتوں کا مرکز تھیں، مشیتِ الٰہی کے تحت اس دارِ ناپائیدار میں زیادہ دیر قیام نہ کر سکیں اور عہدِ طفولیت ہی میں راہِ ملکِ بقا اختیار کر گئیں۔ اُن کی ناگہانی رحلت نے گھر کے در و دیوار پر حزن و ملال کی ایسی کیفیت طاری کر دی کہ گویا گلشنِ مسرت پر خزاں کے سیاہ بادل منڈلانے لگے ہوں۔ حضرت والدِ محترم اُس والہانہ محبت اور

لطیف رفاقت سے محروم رہ گئے جو بہنوں کی صورت میں قدرت کی ایک نہایت نازک اور دلآویز نعمت ہوا کرتی ہے۔

تاہم حضرت والدینِ ماجدین کا قلب یقینِ محکم، صبرِ جمیل اور ایمانِ راسخ کے نور سے اس قدر منور تھا کہ انہوں نے قضا و قدر کے اس المناک فیصلے کو صدائے شکوہ کے بجائے رضا و تسلیم کے جذبے سے قبول کیا۔ اُن کے ایمان افروز طرزِ عمل سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اہلِ یقین مصائب کی تاریکیوں میں بھی رحمتِ خداوندی کی شعاعیں تلاش کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی صبر و رضا کے بعد قدرتِ حق نے ایک بار پھر اس غمزدہ آشیانے میں مسرت کے چراغ روشن فرمائے اور سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک ننھی، حسین و جمیل دختر کی ولادت کی بشارت عطا ہوئی، جس نے گھر کی خاموش فضاؤں کو دوبارہ تبسم، دلکشی اور حیات آفریں شادمانیوں سے معمور کر دیا۔ یہ نومولود ہمشیرہ تنویر مسرت صدیقہ، حضرت والدِ گرامی کے لیے محض ایک بہن نہ تھیں بلکہ طفولیت کی تنہائیوں میں ایک لطیف رفیقہ، معصوم جذبات کی ہمراز، اور محبت و شفقت کے جذبات کو اظہار کا ایک حسین وسیلہ ثابت ہوئیں۔ قدرت نے اُن کے قلب میں اس ننھی کلی کے لیے ایسی والہانہ محبت، محافظانہ شفقت اور بے پناہ انسیت ودیعت فرمائی کہ گویا اُنہیں اپنی فطری مروّت، نگہداشت اور عاطفت کے جوہر نمایاں کرنے کا ایک دلآویز موقع عطا کر دیا گیا ہو۔

سانحۂ عظیم

لیکن ابھی اس خانوادۂ کریمہ کے گلستانِ مسرت نے سابقہ صدمات کے زخموں سے پوری طرح افاقہ بھی نہ پایا تھا کہ تقدیرِ الٰہی نے ایک بار پھر آزمائش کی نہایت جاں گداز اور روح فرسا گھڑی مقدر فرمادی۔ یہ سانحہ اس قدر عظیم، اندوہناک اور ناقابلِ برداشت تھا کہ اُس نے اس خوشحال اور محبتوں سے لبریز آشیانے کی بنیادوں تک کو لرزا کر رکھ دیا۔ حضرت والدِ گرامی کی والدہ ماجدہ، جو اس گھر کی روحِ رواں، سرچشمۂ شفقت اور سایۂ رحمت تھیں، اپنے دو صاحبزادگان، اظہر اور مظہر کی ولادت کے موقع پر سنہ ۱۹۴۹ء میں اس عالمِ فانی سے کوچ فرما گئیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

یوں محسوس ہوا گویا گھر کے آنگن سے رحمت کا وہ دستِ نوازش ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا ہو جس کے لمس سے ہر رنج سکون میں بدل جایا کرتا تھا۔ ممتا کی وہ چھاؤں، جو بچوں کے لیے حصارِ عافیت تھی، اچانک معدوم ہوگئی اور گھر کی فضا پر ایک ایسی ویرانی، خاموشی اور حسرت ناک اداسی چھا گئی جسے الفاظ کے پیمانوں میں مقید کرنا ممکن نہیں۔ حضرت والدِ محترم، جو اس وقت محض آٹھ برس کے ایک معصوم احساسات رکھنے والے طفل تھے، اپنی کمسن فہم کے باوجود اس

عظیم جدائی کے کرب کو رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگے۔ اُن کے معصوم قلب پر یہ احساس بجلی بن کر گرا کہ ماں جیسی بے مثال نعمت اب ہمیشہ کے لیے اُن کی دسترس سے دور ہو چکی ہے۔

وہ ننھا سا دل، جو ابھی تک محبت، تحفظ اور شفقت کے آغوش میں پروان چڑھ رہا تھا، اچانک یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُس کی روح کا کوئی نہایت قیمتی حصہ چاک کر دیا گیا ہو۔ ماں کی جدائی کا درد ایسا سوزِ دروں بن کر اُبھرا جس نے اُن کی داخلی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ قدرت نے مزید آزمائش کے طور پر اُن کے نومولود جڑواں بھائیوں کو بھی اس دنیا میں زیادہ مہلت نہ دی، اور وہ بھی عالمِ بقا کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس پے در پے صدمے نے گھر کے در و دیوار کو ماتم کدہ بنا دیا۔ بے بسی، غم، حسرت، اضطراب اور اشک و آہ کی کیفیت ہر سمت سایہ فگن ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس پُر نور اور خوشیوں سے معمور آشیانے کو کسی حسد زدہ نگاہ نے اچانک ویرانیوں کی نذر کر دیا ہو۔ کھلکھلاہٹ کی جگہ سسکیاں، مسکراہٹوں کی جگہ آنسو، اور طمانیت کی جگہ دل شکستگی نے لے لی۔ خاندان کا ہر فرد غم کے ایسے سمندر میں ڈوب چکا تھا جس کے کنارے دکھائی نہ دیتے تھے۔

حضرت والدِ گرامی کے حساس اور رقیق القلب وجود پر یہ سانحات نہایت گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ کمسنی ہی میں اُنہوں نے زندگی کی بے ثباتی، جدائی کی تلخی اور محرومی کے سوز کو اس شدت

سے محسوس کیا کہ اُن کی طبیعت میں ایک غیر معمولی سنجیدگی، دردمندی اور قلبی گہرائی پیدا ہوگئی۔ ماں کا غم درحقیقت وہ زخم ہے جسے نہ الفاظ پوری طرح بیان کر سکتے ہیں اور نہ ہی وقت آسانی سے مندمل کرسکتا ہے۔ والدہ ماجدہ اپنے پیچھے ادھورے خواب، نامکمل تمنائیں اور بے کنار محبتوں کی وہ متاع چھوڑ گئیں جو ہمیشہ اُن کے بچوں کی یادوں میں مہکتی رہی۔

وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں تو اپنے پس ماندگان میں حضرت والدِ گرامی، اُن کے تین برادرانِ اکابر اور ایک کمسن ہمشیرہ کو چھوڑ گئیں، جو اُن کی شفقت، دعاؤں اور بے مثال محبتوں کی یادوں کے سہارے زندگی کے دشوار مراحل طے کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اُن کی رحلت نے نہ صرف گھر کے ایک فرد کو جدا کیا بلکہ گویا پورے خاندان کے قلب سے سکون، طمانیت اور مادری شفقت کا ایک عظیم سرچشمہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگیا۔ وہ سال حقیقتاً اس خانوادے کے لیے سالِ حزن بن کر طلوع ہوا، جس میں ہر آنکھ اشکبار، ہر دل سوگوار، اور ہر گوش خانہ حسرت وملال کی خاموش داستان سناتا دکھائی دیتا تھا۔

نئی نسبت کی دستک

تقدیر کے صحیفوں میں ابھی حضرت والدِ گرامی کے لیے آزمائشوں اور غیر متوقع تغیرات کے کئی اور ابواب رقم ہونا باقی تھے۔ حیات کے وہ نازک ایام، جو پہلے ہی مادری جدائی کے الم سے زخمی ہو چکے تھے، اب ایک نئے اور نہایت پیچیدہ مرحلے کی جانب بڑھنے لگے۔ والدہ ماجدہ کی رحلت صرف بچوں ہی کے لیے نہیں بلکہ میرے والدِ گرامی کے والد یعنی حضرت داداجان کے لیے بھی ایک ایسا ناقابلِ تلافی صدمہ تھی جس نے اُن کی داخلی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ گھر کی ویرانی، بچوں کی پراگندہ کیفیت اور زندگی کے منتشر نظم کو دیکھتے ہوئے خاندان کے بزرگوں اور متعلقین نے اصرار و الحاح کے ساتھ اُنہیں عقدِ ثانی پر آمادہ کیا، تاکہ بکھرتے ہوئے گھر کو دوبارہ ایک نظم، سہارے اور نگہداشت کی فضا میسر آ سکے۔

چنانچہ سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک نئی خاتون، رشتۂ مادر کی گھونگٹ میں اس گھر میں وارد ہوئیں۔ مگر جس آشیانے میں کبھی مادری شفقت کی مہک، بے ساختہ محبت کی حرارت اور اپنائیت کی نرم روشنی ہر سمت پھیلی ہوئی تھی، وہاں اب حضرت والدِ گرامی کو ہر شے اجنبی، غیر مانوس اور بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہی گھر، وہی در و دیوار، وہی صحن و آنگن —— لیکن فضا کا رنگ بدل چکا

تھا۔ اُن کے حساس اور رقیق القلب وجود کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُن کے اپنے ہی آشیانے کی روح تبدیل ہوگئی ہو۔

والدہِ ثانی اپنے مخصوص مزاج، اپنی ترجیحات اور اپنے طرزِ تدبیر کے ساتھ گھر کے نظم ونسق میں داخل ہوئیں۔ زندگی کے اصول، معمولات اور تعلقات کی نوعیت رفتہ رفتہ ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ اگرچہ حضرت والدِ گرامی اور اُن کے بہن بھائیوں نے حالات سے مطابقت پیدا کرنے اور باہمی موافقت کی حتی المقدور کوشش کی، لیکن مادری خلا کی کسک، کمسنی کی حساسیت اور نفسیاتی فاصلے اس انداز سے حائل رہے کہ قلبی ہم آہنگی آسانی سے قائم نہ ہوسکی۔ نتیجتاً ایک خاموش جذباتی مزاحمت، باطنی اضطراب اور نفسیاتی کشمکش نے گھر کے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا، جس کے اثرات بتدریج حضرت دادا جان تک بھی پہنچنے لگے۔

نفسیاتی کشمکش

حضرت والدِ محترم اُس وقت عمر کے نہایت نازک مرحلے میں تھے؛ ایک ایسا دور جب انسان کا باطن محبت، توجہ اور نفسیاتی سکون کا شدید محتاج ہوتا ہے۔ پے در پے صدمات، گھریلو فضا کی تبدیلی اور جذباتی بے اطمینانی نے اُن کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے قراری اور شوخ مزاجی پیدا کرنا شروع کر دی۔ کبھی کبھی اُن کے مزاج میں ایسی تیزی اور جذباتی شدت نمایاں ہو جاتی جو دراصل اُن کے زخمی باطن کی خاموش ترجمان تھی۔ وہ بچپن، جو کبھی معصوم کھلکھلاہٹ، بے فکری اور شفقت کے سائے میں بسر ہو رہا تھا، اب رفتہ رفتہ سنجیدگی، داخلی کشمکش اور خود اعتمادی کی طرف مائل ہونے لگا۔

تاہم ان تمام آزمائشوں کے باوجود حضرت والدِ گرامی کی شخصیت میں فطری متانت، غیر معمولی فہم اور وقارِ طبع ابتدا ہی سے ودیعت تھا۔ اُن کے اندر ایک ایسی سنجیدہ بصیرت موجود تھی جو کم عمری کے باوجود حالات کا ادراک رکھتی تھی۔ چنانچہ جب اُنہوں نے محسوس کیا کہ داخلی سکون اور شخصیت کی بقا ایک الگ طرزِ حیات اختیار کرنے میں مضمر ہے، تو اُنہوں نے تدبر، خودداری اور استقلال کے ساتھ اپنی راہیں جدا کر لیں۔ انہوں نے زندگی کو اپنے اصولوں،

اپنی عزتِ نفس اور اپنی فکری آزادی کے مطابق بسر کرنے کا عزم اختیار کیا، اور یہی وہ مرحلہ تھا جہاں سے اُن کی شخصیت میں خودانحصاری، استقامت اور غیر معمولی قوتِ ارادی کے اوصاف مزید نکھر کر سامنے آنے لگے۔

اگرچہ گھریلو حالات کے تغیر اور داخلی فاصلے نے حضرت والدِ گرامی کو اپنی راہیں جدا اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، تاہم قدرتِ الٰہی نے اُنہیں ایسے مخلص، دردمند اور وفا شعار نفوس کی رفاقت سے بھی محروم نہ فرمایا جو ہر کٹھن مرحلے میں اُن کے لیے حصارِ محبت و اعتماد بنے رہے۔ خاندان کے متعدد افراد نے اُن کے حساس مزاج، خوددار طبیعت اور داخلی کرب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اُن کی شخصیت کی وقعت، اُن کے جذبات کی نزاکت اور اُن کے طرزِ حیات کے انتخاب کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ یہی سبب تھا کہ رفتہ رفتہ اُنہیں اہلِ خاندان کی جانب سے قلبی تائید، عملی تعاون اور بےلوث شفقت میسر آنے لگی۔

خصوصاً اُن کے برادرانِ اکابر، جو نسبتِ خونی سے بڑھ کر اُن کے رفیقِ راز، مونسِ دل اور مخلص ترین احباب کی حیثیت رکھتے تھے، ہر مرحلے میں اُن کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ اختلافاتِ حالات اور زمانے کی تلخیوں کے باوجود اُن بھائیوں کی محبت، خیر خواہی اور قلبی وابستگی میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ اُن کی رفاقت حضرت والدِ محترم کے لیے محض خاندانی تعلق نہ تھی بلکہ ایک ایسا روحانی سہارا تھی جس نے اُن کے منتشر احساسات کو سنبھالے رکھا۔

اسی طرح والدِ محترم کے تایا حضرت، جناب ظہیر الدین صدیقی صاحب المعاروف بابا تیبہ، جو خانوادے میں وقار، دانائی اور شفقت کے پیکر سمجھے جاتے تھے، نے بھی حضرت والدِ گرامی پر خصوصی التفات اور سرپرستی فرمائی۔ اُن کی حکیمانہ دلجوئی، مشفقانہ طرزِ گفتگو اور حوصلہ افزا رویّے نے حضرت والدِ محترم کے دل میں اعتماد، استقلال اور حیات کے مثبت زاویوں کو مزید مستحکم کیا۔ مزید برآں، والدِ محترم کے بڑے پھوپھو جان کی بے مثال شفقت، مادرانہ محبت اور خاندانی وابستگی نے بھی اُن کی زندگی میں ایک نرم و دلآویز سایۂ رحمت کا کردار ادا کیا۔ اُن کی دعائیں، توجہات اور محبت بھری نگاہیں حضرت والدِ گرامی کے لیے ایک ایسے مرہم کی حیثیت رکھتی تھیں جو ماضی کے زخموں کو خاموشی سے مندمل کرتی رہیں۔

اسی طرح حضرت والدِ گرامی کی محترمہ نانی جان اور دادی جان کی والہانہ شفقت اور خاموش دعاؤں نے بھی اُن کے گرد ایک روحانی حصار قائم کیے رکھا۔ اُن کی شخصیت حضرت والدِ محترم کے لیے گویا ماضی کی بکھری ہوئی ممتا کی آخری جھلک تھی، جس میں اپنائیت، تسلی اور خاندانی حرارت کی باقی ماندہ روشنی موجود تھی۔

ان تمام مخلص ہستیوں کی محبت، دلجوئی اور عملی تعاون نے حضرت والدِ گرامی کو نہ صرف جذباتی استحکام عطا کیا بلکہ اُنہیں زندگی کے تلخ تجربات کے باوجود امید، حوصلے اور مثبت فکر کے ساتھ آگے بڑھنے کا ایک روشن اور باوقار پلیٹ فارم بھی فراہم کیا۔ انہی تعلقات کی خالصانہ قوت

نے اُن کی شخصیت کو مایوسی کی تاریکیوں سے نکال کر عزم، خوداعتمادی اور رجائیت کے ایسے افق پر پہنچایا جہاں سے اُنہوں نے اپنی زندگی کو نئے حوصلے، نئے شعوراور نئے وقار کے ساتھ ازسرِ نوتعمیر کرنا شروع کیا۔

شعور کے دروازے

وقت کا قافلہ بتدریج آگے بڑھتا رہا اور حضرت والدِ گرامی کی حیات ایک نئے مرحلۂ ارتقاء میں داخل ہونے لگی۔ طفولیت کی معصوم فضاؤں سے نکل کر اب اُن کے سامنے علم، شعور اور عملی زندگی کے ابتدائی دروازے کشادہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ تعلیم کے مبارک سفر کا آغاز نیشنل اسکول سے ہوا، جہاں اُن کے ذہن و فکر نے پہلی مرتبہ باقاعدہ علمی تربیت، نظم و ضبط اور اجتماعی زندگی کے آداب سے آشنائی حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب زندگی کے دائرے وسیع ہونا شروع ہوئے، نئے چہرے، نئی رفاقتیں اور نئے تجربات اُن کی شخصیت کا حصہ بننے لگے۔ متعدد احباب اُن کی زندگی میں شامل ہوئے، جن کے ساتھ علمی، اخلاقی اور سماجی تعلقات نے اُن کے مزاج میں مزید وسعت اور پختگی پیدا کی۔ رفتہ رفتہ اُن کی زندگی ایک منظّم معمول، متعین اوقات، تعلیمی انہماک اور مقصدیت کی طرف مائل ہونے لگی۔ گویا وہ منتشر احساسات، جو ماضی کے حادثات نے اُن کے باطن میں پیدا کر دیے تھے، اب علم، مصروفیت اور تربیت کے سانچے میں ڈھل کر ایک متوازن شخصیت کی تشکیل کر رہے تھے۔



محترم والد صاحب اور ظفر تایا ابا



محترم والد صاحب، بڑے (فاروق) تایا ابا اور ظفر تایا ابا

شفقت کی دلآویز مہک

سنہ۱۹۵۹ء، ایک نہایت مبارک، پُرمسرت اور سعادت آفریں باب لے کر طلوع ہوا، جب حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے برادرِ محترم (فاروق تایا صاحب) رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ یہ عقدِ مسعود محض ایک خاندانی تقریب یا نئے تعلق کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس گھر میں رحمت، شفقت، انسیت اور مادری محبت کی ایک نئی صبح کا آغاز تھا۔ قدرتِ الٰہی نے اس نئی نسبت کی صورت میں گھر کو ایک ایسی ہستی عطا فرمائی جو رفتہ رفتہ حضرت والدِ گرامی اور اُن کے بہن بھائیوں کے لیے محض بھابی جان نہیں بلکہ ممتا، شفقت اور بے لوث محبت کی جیتی جاگتی تصویر بن گئیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا مدتوں سے آزمائشوں، محرومیوں اور جذباتی خلا کے بوجھ تلے دبی ہوئی اس زندگی پر ایک بار پھر محبت کے بادل سایہ فگن ہو گئے ہوں۔ گھر کے در و دیوار، جو کبھی غم کی خاموشیوں سے بوجھل دکھائی دیتے تھے، اب محبت، اپنائیت اور شفقت کی دلآویز مہک سے معطر ہونے لگے۔ اس نئی آمد نے گویا اس گھر کے بکھرے ہوئے احساسات کو ایک مرتبہ پھر محبت کے ریشمی دھاگوں میں پرو دیا۔

والدِ گرامی کے بھابی جان (میرے بڑے تائی ماں) کی طبیعت میں بے پناہ شفقت، حلم، اخلاص اور ایثار کی ایسی دلآویز کیفیت موجود تھی کہ وہ ہر لمحہ حضرت والدِ گرامی اور اُن کے بہن بھائیوں کی ضروریات، جذبات اور آسودگی کا نہایت باریک بینی اور محبت کے ساتھ خیال رکھتیں۔ اُن کا اندازِ نگہداشت اس قدر مادرانہ اور دلنواز تھا کہ حضرت والدِ محترم کے قلب میں مدتوں سے موجود مادری خلا کو ایک حد تک تسکین میسر آنے لگی۔ وہ گویا اس گھر میں فرشتہ رحمت بن کر آئیں، جنہوں نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو شفقت کی حرارت، محبت کی نرمی، اور خلوص کی روشنی عطا کی۔



محترم والد صاحب، بڑے تائی ماں، بڑے پھوپھو، چھوٹے تایا ابا، محسنہ پھوپھو

حضرت والدِ گرامی بھی اُن کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے دل میں بھابی جان کے لیے نہ صرف ادب موجود تھا بلکہ ایک گہری قلبی وابستگی، اخلاص اور ممنونیت کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا۔ وہ اُنہیں محض ایک رشتہ دار کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی محسن و مشفق ہستی کے طور پر دیکھتے تھے جنہوں نے اُن کے نازک احساسات کو سہارا دیا، اُن کے بکھرے ہوئے جذبات کو محبت سے سنوارا، اور اُن کی زندگی میں اپنائیت کا ایک نیا باب روشن کیا۔

بھابی جان اور برادرانِ اکابر دونوں ہی حضرت والدِ گرامی کی تعلیم، شخصیت سازی اور روشن مستقبل کے حوالے سے نہایت سنجیدہ اور فکر مند رہتے تھے۔ وہ ہر وقت اُنہیں علم کے میدان میں انہماک، محنت، مستقل مزاجی اور بلند عزائم کے ساتھ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے۔ اُن کی حوصلہ افزائی، دعائیں اور مشفقانہ رہنمائی، حضرت والدِ محترم کے لیے ایک ایسی روحانی و جذباتی قوت بن گئی جس نے اُن کے اندر تعلیمی لگن، خود اعتمادی اور کامیابی کے عزم کو مزید مستحکم کر دیا۔ یوں یہ مبارک رشتہ اس خانوادے کے لیے محض ایک سماجی تعلق نہ رہا بلکہ رحمت، سکون، تربیت اور محبت کا ایسا سرچشمہ ثابت ہوا جس نے حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کے جذباتی اور فکری ارتقاء میں نہایت اہم اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔

پہلا چشم و چراغ

قدرتِ الٰہی نے اس گھرانے کو مزید مسرتوں اور نئی نسل کی خوشبوؤں سے نوازنے کا فیصلہ فرمایا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۶۰ء میں اس گھرانے میں ایک نہایت مبارک اور فرحت آفریں خوشخبری نے پورے گھر کو شادمانی، دعاؤں اور قلبی مسرت سے بھر دیا۔ حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے برادرِ محترم کے آنگن میں صاحبزادے کی ولادت ہوئی، جن کا اسمِ گرامی قاضی سعودالرحمٰن صدیقی رکھا گیا۔

یہ ننھا فرزند درحقیقت اس خاندان کی نئی نسل کا پہلا چشم و چراغ تھا، جس کی آمد نے پورے گھر کے ماحول کو ایک نئی زندگی، نئی رونق اور نئی امید عطا کر دی۔ گویا مدتوں کے نشیب و فراز، آزمائشوں اور تلخیوں کے بعد قدرت نے اس آشیانے میں معصوم مسکراہٹوں، بچپن کی شوخیوں اور نئی زندگی کی دلآویز آہٹوں کو پھر سے آباد کر دیا ہو۔ گھر کے ہر فرد کی نگاہوں میں محبت، لبوں پر دعائیں، اور دلوں میں اس نومولود کے لیے بے پناہ شفقت موجزن تھی۔

حضرت والدِ گرامی کے لیے تو یہ ننھی سی ہستی گویا قلبی سکون، خوشی اور معصوم رفاقت کا ایک نیا جہان بن گئی۔ وہ اپنے بھتیجے (سعود بھائی) سے بے حد محبت فرمایا کرتے تھے، اور رفتہ رفتہ یہ ننھا بچہ اُن کی زندگی کا مستقل ساتھی، دل بہلانے والا رفیق، اور خوشیوں کا مرکز بنتا چلا گیا۔ حضرت والدِ محترم اپنی مصروفیات، فکری الجھنوں اور زندگی کی سنجیدگیوں کے باوجود جب اس معصوم بچے کے ساتھ وقت گزارتے تو اُن کے چہرے پر ایک خاص قسم کی بشاشت، نرمی اور قلبی اطمینان نمایاں ہو جاتا۔

یہی وجہ تھی کہ سعود بھائی صاحب حضرت والدِ گرامی کے لیے محض ایک بھتیجے کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ اُن کے بچپن، جوانی اور زندگی کے نہایت حسین اور روشن لمحات کا حصہ بن گئے۔ اُن کی معصوم حرکات، کھیل کود، بچکانہ شوخیاں اور بے ساختہ اپنائیت حضرت والدِ محترم کی زندگی کے اُن جذباتی گوشوں کو تازگی عطا کرتی رہی جنہیں زمانے کی سختیوں نے کبھی بوجھل کر دیا تھا۔ یوں اس نئی نسل کے آغاز نے نہ صرف اس خاندان کے مستقبل کو ایک نئی جہت عطا کی بلکہ حضرت والدِ گرامی کے قلب میں بھی محبت، امید اور خاندانی وابستگی کے احساسات کو مزید گہرائی اور وسعت بخشی۔

اضطراب وتحمل

اگرچہ حضرت والدِ گرامی کو اپنے برادرانِ اکابر اور بعض مخلص اہلِ خاندان کی جانب سے بے پناہ محبت، شفقت اور قلبی سہارا میسر تھا، تاہم حیات کے افق پر کچھ ایسے تاریک سائے بھی مسلسل منڈلاتے رہے جنہوں نے گھر کے پُرسکون ماحول کو بارہا اضطراب اور کشمکش کی فضا میں مبتلا رکھا۔ خاندانی تعلقات کے ظاہری وقار اور باہمی وابستگی کے باوجود داخلی سطح پر بعض نظریاتی اختلافات، مزاجی تفاوت اور گھریلو نظم ونسق کے حوالے سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں رفتہ رفتہ ایک خاموش تناؤ کی صورت اختیار کرتی گئیں۔

خصوصاً حضرت دادا جان اور اُن کے نئے گھرانے کے درمیان طرزِ فکر، معاملاتِ خانہ داری اور زندگی کے بعض اصولوں کے متعلق اختلافات وقتاً فوقتاً ایسی صورت اختیار کر لیتے تھے جن کے اثرات پورے گھر کے ماحول پر مرتب ہوتے۔ سخت مزاجی، غیر معمولی پابندیوں اور بعض اوقات حد درجہ سخت گیر طرزِ عمل نے گھر کی فضا کو ایک غیر محسوس بوجھ اور دباؤ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس آشیانے میں محبت کے چراغ روشن ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں اضطراب اور بے سکونی کی دھیمی آنچ بھی مستقل سلگ رہی ہے۔

حضرت والدِ گرامی چونکہ فطرتاً نہایت حساس القلب، خوددار اور گہرے احساسات رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے، اس لیے یہ داخلی کشمکشیں اور مسلسل ذہنی تناؤ اُن کے باطن پر خاموش مگر گہرے اثرات مرتب کرتے رہے۔ گھر کے ماحول میں پیدا ہونے والی سختی، ضدی طرزِ فکر اور بعض معاملات میں لچک کے فقدان کے باعث اکثر اختلافات اور تلخیوں کی کیفیت جنم لیتی، جو بالآخر جذباتی اضطراب اور نفسیاتی بے چینی کا سبب بن جاتی۔

حضرت والدِ محترم کے لیے یہ صورتحال اس اعتبار سے بھی نہایت صبر آزما تھی کہ ایک طرف وہ تعلقات کی حرمت اور بزرگوں کے ادب کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے، جبکہ دوسری طرف اُن کا حساس ذہن مسلسل ان گھریلو کشمکشوں کی تلخی کو محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ اُن کے قلب میں خاموشی، سنجیدگی اور داخلی تحمل کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہونے لگی جو بعد کے زمانوں میں اُن کی شخصیت کے وقار، متانت اور برداشت کا اہم حصہ بن گئی۔

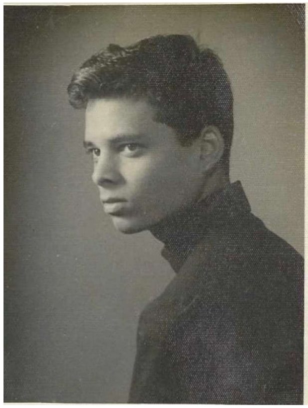
درحقیقت یہی آزمائشیں تھیں جنہوں نے حضرت والدِ گرامی کو وقت سے پہلے زندگی کی پیچیدگیوں، انسانی مزاجوں کے تضادات، اور تعلقات کی نزاکتوں کا شعور عطا کیا۔ اگرچہ یہ حالات اُن کے لیے نفسیاتی طور پر تکلیف دہ تھے، مگر انہی دشوار مراحل نے اُن کی شخصیت میں ضبطِ نفس، تحمل، خود انحصاری اور فکری پختگی کے وہ اوصاف پیدا کیے جو بعد میں اُن کی پوری زندگی کے کردار اور وقار کی بنیاد بنے۔

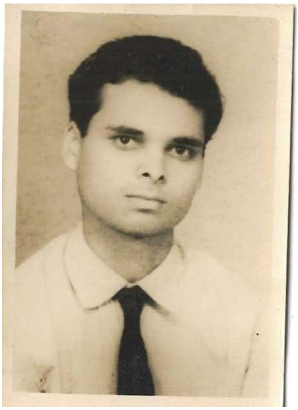
علی گڑھ کا تعلیمی سفر

ان گھریلو ماحول کے چلتے، والدِ بزرگوار کے برادرانِ اکابر کے دلوں میں ایک خاموش تشویش بدستور موجود تھی۔ وہ بخوبی محسوس کرتے تھے کہ اس ماحول میں جاری پیچیدہ داخلی کشمکشیں، تعلقات کی سیاست اور نفسیاتی تناؤ کہیں حضرت والدِ گرامی کے حساس ذہن اور بلند حوصلہ طبیعت پر منفی اثرات مرتب نہ کر دیں۔ اُنہیں اندیشہ تھا کہ اگر یہی ماحول مستقل طور پر اُن کے گرد حائل رہا تو اُن کی فکری یکسوئی، قلبی سکون اور مستقبل کے امکانات متاثر ہو سکتے ہیں۔

اسی دور اندیشی اور مستقبل بین نگاہ کے تحت حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے بھائی، جناب فاروق صدیقی صاحب، نے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن قدم اٹھانے کا عزم کیا۔ اُنہوں نے یہ طے کیا کہ حضرت والدِ گرامی کو ایک وسیع تر علمی، تہذیبی اور فکری ماحول میسر آنا چاہیے، جہاں اُن کی صلاحیتیں آزادانہ طور پر نشوونما پا سکیں اور اُن کا ذہن محدود گھریلو کشمکشوں سے نکل کر بلند تر مقاصد کی طرف متوجہ ہو سکے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۶۱ء میں اُنہوں نے والدِ محترم کو اُن کے بڑے بھائی جناب ظفر صدیقی صاحب کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی روانہ کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔

یہ درحقیقت حضرت والدِ گرامی کی حیات کا ایک اعظیم اور فیصلہ کن موڑ تھا۔ گھر کی محدود اور جذباتی فضا سے نکل کر اب وہ ایک ایسے جہان میں قدم رکھ رہے تھے جہاں علم کے نئے افق، خوابوں کی نئی تعبیریں، شخصیت سازی کے نئے امکانات اور زندگی کے رنگا رنگ تجربات اُن کے منتظر تھے۔ علی گڑھ کی علمی و تہذیبی فضا نے اُن کے سامنے حیات کے ایک بالکل نئے منظرنامے کو آشکار کیا، جہاں اُنہوں نے پہلی مرتبہ گھر کی حدود سے دور رہ کر خود انحصاری، بلند ہمتی، وسیع النظری اور عملی جدوجہد کے حقیقی معانی کو محسوس کیا۔





یہی وہ مرحلہ تھا جہاں حضرت والدِ گرامی کی شخصیت نے ایک نئے شعوری ارتقاء کا آغاز کیا؛ ایک ایسا ارتقاء جس نے اُن کے اندر پوشیدہ عزائم کو بیدار کیا، اُن کی فکری جہات کو وسعت بخشی، اور اُنہیں مستقبل کی اُن بلند راہوں کے لیے آمادہ کیا جن پر چل کر بعد میں اُنہوں نے اپنی ذات کو وقار، استقامت اور کامیابی کی روشن مثال بنا دیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علمی، تہذیبی اور روح پرور فضا میں حضرت والدِ گرامی کی زندگی کا ایک نہایت تابناک، دلآویز اور شخصیت ساز دور آغاز پذیر ہوا۔ یہاں انہوں نے جماعتِ دہم سے اپنے تعلیمی سفر کا باقاعدہ آغاز کیا اور پھر اپنے برادرِ اکبر جناب ظفر صدیقی صاحب کی معیت میں نہایت شوق، انہماک اور بلند عزائم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کرنے لگے۔ علی گڑھ کی سرزمین اُن کے لیے محض ایک درسگاہ نہ تھی بلکہ ایک ایسی فکری و تہذیبی دنیا تھی جہاں اُن کی شخصیت کے مخفی گوشے بیدار ہوئے، اُن کے خوابوں کو نئی تعبیر ملی، اور اُن کی فکر کو وسعتِ آفاق نصیب ہوئی۔

یونیورسٹی کی ہمہ رنگ فضا میں ملک کے مختلف خطّوں، تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ سے اُن کی رفاقتیں قائم ہوئیں۔ یہ تعلقات محض وقتی دوستیوں تک محدود نہ تھے بلکہ اُنہوں نے حضرت والدِ محترم کے مزاج میں وسعتِ ظرف، قومی ہم آہنگی، سماجی شعور اور انسانی قدروں کی گہری تفہیم پیدا کی۔ ہر نئی شخصیت، ہر نئی ثقافت اور ہر نئے تجربے نے اُن کے ذہن و فکر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ گویا علی گڑھ کی فضا اُن کے لیے ایک ایسا گلستان ثابت ہوئی جہاں علم کے ساتھ ساتھ تہذیب، اخوت، رواداری اور حیات فہمی کے خوش رنگ پھول بھی کھلتے رہے۔

یونیورسٹی کے وسیع و عریض کیمپس اور ہاسٹل کی زندگی نے اُنہیں خود اعتمادی، نظم و ضبط اور عملی خود کفالت کا ایک نیا شعور بخشا۔ وہ نہایت مسرت اور ولولے کے ساتھ اپنی تعلیمی مصروفیات میں حصہ لیتے، اور وقتاً فوقتاً اُن کے برادرانِ اکابر بھی اُن سے ملاقات کے لیے علی گڑھ تشریف لاتے، جس سے اُن کی زندگی میں گھریلو محبت اور خاندانی وابستگی کی حرارت ہمیشہ برقرار رہتی۔

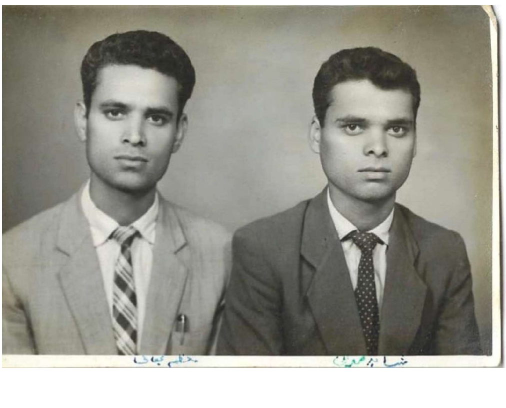
یہی ایام تھے جب حضرت والدِ گرامی نے اپنے بھائیوں کے ہمراہ متعدد تاریخی، تہذیبی اور سیاحتی مقامات کی سیر بھی کی۔ آگرہ کا قلعہ کی شان و شوکت، فتح پور سکری کی مغلیہ عظمت، تاج محل کی لازوال رومانیت وفنّی جمال، لال قلعہ کی تاریخی ہیبت، مسوری کی پُر فضا وادیاں اور دہرادون کی دلنشین فضاوں نے اُن کے ذوقِ جمال، فکری وسعت اور مشاہداتی شعور کو مزید نکھارا۔ یہ اسفار اُن کے لیے محض تفریحی لمحات نہ تھے بلکہ تاریخ، تہذیب اور قدرتی حسن سے ایک زندہ مکالمہ تھے، جنہوں نے اُن کے اندر موجود جمالیاتی احساسات کو مزید گہرائی عطا کی۔





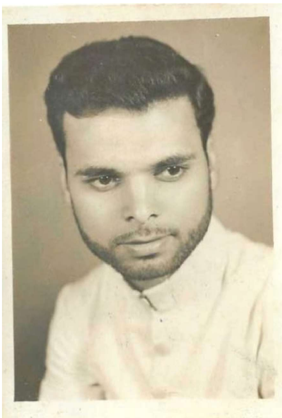
علی گڑھ میں حضرت والدِ گرامی کی زندگی ہمہ جہت سرگرمیوں سے معمور رہی۔ وہ صرف نصابی میدان ہی میں نمایاں نہ تھے بلکہ مختلف تعلیمی، ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے۔ مباحثے، ادبی سرگرمیاں، ثقافتی اجتماعات، طلبہ کی مجالس اور دیگر متنوع پروگراموں میں اُن کی فعال شرکت نے اُن کی شخصیت کو اعتماد، فصاحت، قیادت اور سماجی وقار کے اوصاف سے آراستہ کیا۔





واقعی اُن کے لیے علی گڑھ کی زندگی کسی جنتِ ارضی سے کم نہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماضی کے غموں کی تلخیاں بتدریج علم، رفاقت، امید اور مقصدیت کی روشنی میں تحلیل ہونے لگیں۔ اگرچہ معاشی دشواریاں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہتی تھیں، اور وسائل کی تنگی کبھی کبھی زندگی کو مشکل بنا دیتی تھی، لیکن اُن کے برادرانِ اکابر ہر مرحلے میں اُن کے لیے دیوارِ حمایت بنے رہے۔ اُن کی شفقت، قربانی، مالی تعاون اور خلوص نے حضرت والدِ محترم کو کبھی تنہائی یا بے سہارگی کا احساس نہ ہونے دیا۔





یوں علی گڑھ کے یہ سنہرے ایام حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کی تعمیر، اُن کے فکری ارتقاء اور اُن کے خوابوں کی تشکیل کا ایک نہایت اہم باب ثابت ہوئے، جہاں اُنہوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ زندگی کو ایک وسیع، بامعنی اور باوقار زاوی نگاہ سے دیکھنا بھی سیکھا۔

رفاقتوں کا سرمایہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درخشاں ایام کی سب سے حسین اور یادگار متاع اگر کوئی تھی تو وہ اُن مخلص، بے لوث اور روح پرور رفاقتوں کا سرمایہ تھا جو حضرت والدِ گرامی کو وہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے اس حساس اور تشکیل پذیر دور میں بعض شخصیات ایسی بھی اُن کے قریب آئیں جنھوں نے محض وقتی تعلقات یا رسمی شناسائی کی حد تک نہیں بلکہ قلبی ہم آہنگی، فکری موافقت اور روحانی انسیت کے ساتھ اُن کی حیات میں ایک مستقل نقش چھوڑا۔ ان احباب میں خصوصیت کے ساتھ شمیم، کریم، اور راؤ فرحت صاحب کے اسمائے گرامی حضرت والدِ محترم ہمیشہ نہایت محبت، عقیدت اور قلبی وارفتگی کے ساتھ یاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ تمام رفقاء ایس ایس ایسٹ ہوسٹل میں اُن کے ہم کمرہ طلبہ تھے اور اُن کی رفاقت محض ایک ہاسٹل کے محدود کمروں تک مقید نہ تھی بلکہ یہ تعلق دلوں کی ایسی قربت میں ڈھل چکا تھا جہاں اعتماد، اخلاص، بے تکلفی کی خوشبو ہر لمحہ محسوس ہوتی تھی۔ جوانی کے وہ سنہرے دن، جب خواب اپنی ابتدائی تعبیرات تلاش کر رہے ہوتے ہیں اور انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے، اُن ایام میں ایسے مخلص رفقاء کا ساتھ کسی عظیم نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

شمیم صاحب کی خوش مزاجی، کریم صاحب کی بے ساختہ اپنائیت، اور راؤ فرحت صاحب کی سنجیدہ مگر نہایت مشفق رفاقت نے حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں ایسی قلبی حرارت پیدا کر دی تھی کہ پردیس کی اجنبیت بھی مانوسیت میں بدل گئی۔ وہ سب نہ صرف ایک دوسرے کے تعلیمی ساتھی تھے بلکہ دکھ سکھ کے شریک، رازدارِ دل، مشیرِ حیات اور جذباتی سہارا بھی تھے۔ ہاسٹل کی شب بیداریاں، طویل علمی و ادبی گفتگوئیں، مستقبل کے خواب، زندگی کے نشیب و فراز پر تبادلہ خیال، اور مشترکہ مسکراہٹوں و پریشانیوں کے وہ لمحات حضرت والدِ گرامی کی یادداشت کے نہایت روشن اور قیمتی ابواب بن گئے۔

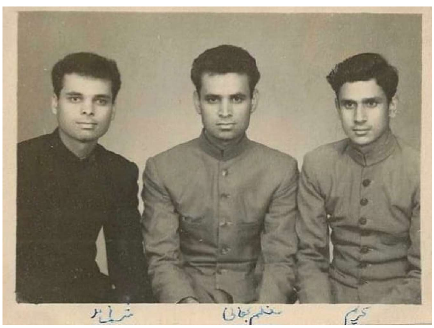


یہ دوستی محض وقتی شبابِ عمر کی رفاقت نہ تھی بلکہ اس میں خلوص کی وہ پختگی موجود تھی جو وقت کے گزرنے کے باوجود دلوں کے افق پر ماند نہیں پڑتی۔ اُن احباب کے ساتھ حضرت والدِ محترم کا تعلق اس درجہ گہرا اور ذاتی نوعیت کا تھا کہ ایک دوسرے کے جذبات، مشکلات، امیدوں اور باطنی کیفیات تک میں حقیقی شرکت محسوس کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعد کے زمانوں میں

بھی جب حضرت والدِ گرامی ماضی کے اوراق الٹتے تو علی گڑھ کی علمی فضاؤں کے ساتھ ساتھ اُن دوستوں کی محبت، بے تکلف محفلیں اور خلوص سے لبریز رفاقتیں اُن کے لہجے میں ایک خاص جذباتی وارفتگی پیدا کر دیا کرتی تھیں۔

درحقیقت علی گڑھ نے حضرت والدِ گرامی کو صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ ایسے مخلص انسانوں کی رفاقت بھی عطا کی جنہوں نے اُن کی شخصیت کو جذباتی استحکام، سماجی وقار اور انسانی تعلقات کی لطافتوں سے آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن دوستیوں کی خوشبو وقت کی گرد میں بھی کبھی مدھم نہ ہو سکی، بلکہ وہ والدِ محترم کی زندگی کے حسین ترین اور قیمتی ترین اثاثوں میں شمار ہوتی رہی۔







غم کا عمیق سمندر

حیات کے صحیفے میں ابھی حضرت والدِ گرامی کے لیے ایک اور نہایت جاں سوز، روح فرسا اور تقدیر شکن باب رقم ہونا باقی تھا۔ ابھی علی گڑھ کی پُر رونق علمی فضا، رفاقتوں کی دلنوازی اور مستقبل کے حسین خواب اُن کی زندگی میں امید کے چراغ روشن کیے ہوئے تھے کہ اچانک قضا و قدر نے ایک ایسا کاری وار کیا جس نے اُن کے قلب و روح کو ایک بار پھر غم کے عمیق سمندر میں ڈبو دیا۔ یہ حادثہ محض ایک سانح اتفاقیہ نہ تھا بلکہ حضرت والدِ محترم کی حیات کا وہ الم ناک موڑ تھا جس نے اُن کی داخلی دنیا کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایام میں ایک شام، جب فضا اپنے معمول کے سکون اور دلکشی میں ڈوبی ہوئی تھی اور حضرت والدِ گرامی اپنے برادرِ محترم جناب ظفر صدیقی صاحب کے ہمراہ شہر کے بازار میں چہل قدمی کیے گھوم رہے تھے، اس وقت قسمت ایک ہولناک منظر اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار اور بے قابو گاڑی نہایت خطرناک انداز میں اُن کی سمت بڑھی اور چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا کہ موت اپنی پوری شدت کے ساتھ حضرت والدِ گرامی کی جانب لپک رہی ہے۔

مگر اُس لمحہِ ہولناک، جب موت اپنی پوری سفا کی کے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی محسوس ہورہی تھی اور وقت گویا ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگیا تھا، برادرانہ محبت، ایثارِ جاں، محافظانہ حمیت اور قلبی فدائیت کا ایک ایسا عظیم و بے مثال منظر نمودار ہوا جسے تقدیر بھی ہمیشہ اپنے اوراق میں سنہرے حروف سے محفوظ رکھنے پر مجبور رہے گی۔ جناب ظفر تایا صاحب کے قلبِ مشفق میں اپنے چھوٹے بھائی کی حفاظت کا جذبہ اس شدت سے موجزن ہوا کہ انہوں نے نہ اپنی جان کی پروا کی، نہ حادثے کی ہولنا کی کا اندازہ کیا، اور نہ ہی خوف وتردد کو اپنے ارادے کے قریب آنے دیا۔

صرف ایک لمحے میں، ایک بے اختیار مگر عظیم قربانی کے جذبے کے تحت، انہوں نے پوری قوت کے ساتھ حضرت والدِ گرامی کو موت کے راستے سے دور دھکیل دیا، گویا اپنی زندگی کی تمام توانائی اپنے چھوٹے بھائی کے وجود کو محفوظ رکھنے کے لیے وقف کردی ہو۔ اُس لمحے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک بڑے بھائی کا دل اپنے لاڈلے چھوٹے بھائی کے لیے ڈھال بن کر تقدیر کے مہلک وار کو اپنے سینے پر جھیلنے کے لیے آمادہ ہوگیا ہو۔ قدرتِ الٰہی نے حضرت والدِ گرامی کی حیات کو محفوظ رکھنے کے لیے، جناب ظفر تایا صاحب کی محبت کو ایک زندہ حصار، ایک خاموش قربانی، اور ایک ڈھال کی صورت عطا فرما دی۔

حضرت والدِ گرامی تو اُس اچانک دھکے کے باعث محفوظ ہو گئے، مگر جناب ظفر تایا صاحب خود اُس تیز رفتار اور سنگدل حادثے کی پوری شدت کا شکار ہو گئے۔ اُن کا جسم زوردار ٹکر کے ساتھ زمین پر گرا، اور وہ شدید زخمی حالت میں بے ہوش ہو کر خاک پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ منظر اس قدر دردناک، روح فرسا اور دل چیر دینے والا تھا کہ گویا ایک بھائی نے اپنے وجود کا چراغ بجھا کر دوسرے بھائی کی زندگی کو روشن رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

یہ منظر حضرت والدِ گرامی کے لیے کسی قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ ہر طرف اضطراب اور بے بسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ فوراً انہیں ہسپتال منتقل کیا گیا، جہاں احباب اور متعلقین کی دعائیں، اشکبار آنکھوں کے ساتھ اُن کی صحت یابی کے لیے بلند ہونے لگیں۔ علی گڑھ کی فضائیں گویا دعا، اضطراب اور امید کے امتزاج سے بھر گئیں۔ مگر حادثے کی شدت اور اندرونی زخم اس قدر مہلک تھے کہ حالت مسلسل تشویشناک بنی رہی۔

دو دن تک موت و حیات کی کشمکش جاری رہی۔ پھر قدرت نے ایک لمحے کے لیے اُنہیں ہوش عطا کیا۔ جب جناب ظفر تایا صاحب نے آنکھیں کھولیں تو اُن کی نگاہ سب سے پہلے حضرت والدِ گرامی کے چہرے پر پڑی۔ اُس لمحے اُن کے لبوں پر ایک نہایت پُرسکون، مطمئن اور محبت بھری مسکراہٹ ابھری — گویا وہ اس بات پر قلبی اطمینان محسوس کر رہے ہوں کہ اُن کا چھوٹا بھائی محفوظ ہے، اُس کی زندگی سلامت ہے، اور اُن کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔

یہ سکون کا آخری لمحہ تھا۔ اُس اطمینان بھرے تبسم کے بعد اُنہوں نے خاموشی سے اپنی آنکھیں موند لیں اور ہمیشہ کے لیے اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ یوں حضرت والدِ گرامی نے پل بھر میں اپنے اُس بھائی کو کھو دیا جو اُن کے لیے محض برادرِ اکبر نہ تھا بلکہ محافظ، مونس، راہنما، رفیقِ حیاتِ طلبہ، جذباتی سہارا اور علی گڑھ کی اجنبی دنیا میں اُن کے اعتماد و سکون کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہ لمحہ حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں گویا آسمان کے ٹوٹ پڑنے کے مترادف تھا۔ علی گڑھ، جو اُن کے لیے علم، امید اور روشن مستقبل کی علامت تھا، اچانک ایک ویران صحرا محسوس ہونے لگا۔ جس شخصیت کے سہارے وہ گھر سے دور اس نئی دنیا میں پُراعتماد زندگی گزار رہے تھے، وہی ہستی اُنہیں تنہا چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔ اُن کے باطن پر یہ صدمہ اس شدت سے وارد ہوا کہ گویا ماضی کے تمام زخم ایک بار پھر تازہ ہو گئے ہوں۔ ماں کی جدائی کے بعد یہ دوسرا ایسا سانحہ تھا جس نے اُن کے قلب کی گہرائیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

تاہم اس شدید غم، بے پناہ ٹوٹ پھوٹ اور روحانی کرب کے باوجود حضرت والدِ گرامی نے جس صبر، ضبطِ نفس اور استقامت کا مظاہرہ کیا، وہ اُن کی غیر معمولی داخلی قوت اور اعلیٰ تربیت کا روشن ثبوت تھا۔ اُن کے جذبات یقیناً مضطرب تھے، دل غم سے چور تھا، مگر انہوں نے اپنے آپ کو مایوسی، بے صبری یا شکست خوردگی کے حوالے نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے اس سانحے کو حیات کے اُن تلخ مگر ناگزیر اسباق میں شمار کیا جنہیں قبول کرنا مردانِ حوصلہ کا شیوہ ہوتا ہے۔



یہ دراصل اُن کے برادرانِ اکابر کی تربیت، اُن کی نصیحتوں، اور خاندانی وقار و استقامت کے اُن اصولوں کا اثر تھا جو بچپن ہی سے حضرت والدِ گرامی کے قلب و ذہن میں راسخ کیے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کردار، اپنے ضبط، اور اپنے عملی استقلال سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم انسان وہ نہیں جو آزمائشوں سے محفوظ رہے، بلکہ وہ ہے جو شدید ترین طوفانوں میں بھی اپنے حوصلے، اپنے وقار اور اپنے مقصد کو متزلزل نہ ہونے دے۔

یوں جناب ظفر تایا صاحب کی یہ عظیم قربانی حضرت والدِ گرامی کی زندگی کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش باب بن گئی جس نے اُنہیں جذباتی طور پر مزید پختہ، فکری طور پر مزید سنجیدہ، اور عملی طور پر مزید ثابت قدم بنا دیا۔

جناب ظفر تایا صاحب کی ناگہانی رحلت کی خبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علمی فضا میں اس سرعت اور شدت کے ساتھ پھیلی کہ گویا پوری یونیورسٹی ایک ہی لمحے میں سوگ، حیرت اور رنج والم کی کیفیت میں ڈوب گیا ہو۔ اس اندوہناک سانحے نے نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہِ کرام، انتظامیہ اور یونیورسٹی سے وابستہ ہر حساس دل کو شدید متاثر کیا۔ ہر زبان پر افسوس، ہر نگاہ میں اشک، اور ہر دل میں حضرت والدِ گرامی کے لیے بے پناہ ہمدردی اور دعاؤں کا جذبہ موجزن تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے علی گڑھ کی فضائیں خود اس عظیم قربانی پر نوحہ کناں ہوں۔

جناب ظفر تایا صاحب، جو اپنی شرافت، متانت، اخلاص اور برادرانہ ایثار کی بدولت اہلِ یونیورسٹی میں عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، کو یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اُن کے جنازے میں شرکت کے لیے لوگوں کا ایک غیر معمولی ہجوم اُمڈ آیا۔ طلبہ، اساتذہ، رفقاء، ذمہ دارانِ یونیورسٹی اور متعدد معزز شخصیات اس غم انگیز لمحے میں شریک ہوئیں۔ گویا پورا علی گڑھ اُن کی جدائی کے غم میں ایک خاندان کی صورت جمع ہو گیا ہو۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل اس بے مثال قربانی کے تصور سے لرزاں۔ وہ جنازہ محض ایک فرد کی تدفین نہ تھا بلکہ ایثار، محبت اور برادرانہ وفا کے ایک عظیم باب کو سپردِ خاک کیے جانے کا منظر تھا۔



تعزیت وحوصلہ افضائی

اس پُر ملال موقع پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، بدرالدین سیف طیب جی نے نہایت خصوصی شفقت اور قلبی دردمندی کے ساتھ حضرت والدِ گرامی سے تعزیت فرمائی۔ اُنہوں نے حضرت والدِ محترم کے غم کو صرف رسمی انداز میں محسوس نہیں کیا بلکہ اُن کے صبر، ضبطِ نفس اور غیر معمولی جذباتی استقامت کو نہایت تحسین واحترام کی نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے حضرت والدِ گرامی کی حوصلہ مندی کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ ایسے صدمات انسان کو توڑ بھی دیتے ہیں اور عظیم بھی بنا دیتے ہیں، اور اُنہیں یقین ہے کہ حضرت والدِ محترم اپنی استقامت، سنجیدگی اور عزم کے ذریعے مستقبل میں ایک نمایاں اور باوقار مقام حاصل کریں گے۔

وائس چانسلر صاحب نے محض زبانی تسلی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بحیثیتِ سربراہِ یونیورسٹی خصوصی شفقت اور ہمدردی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت والدِ گرامی کی تعلیمی ذمہ داریوں اور قیامِ یونیورسٹی میں خصوصی رعایت وسہولت عطا فرمائی، تاکہ وہ اس عظیم سانحے کے بعد ذہنی و جذباتی طور پر خود کو سنبھال سکیں۔ یہ اقدام درحقیقت جامعہ کی اُس اعلیٰ تہذیبی وانسانی روایت کا مظہر تھا جس میں طلبہ کو محض طالبِ علم نہیں بلکہ اپنے خاندان کا فرد سمجھا جاتا تھا۔

حضرت والدِ گرامی کے لیے یہ ایام اگرچہ غم واندوہ کی انتہا تھے، مگر اسی غم کے سمندر میں اُنہیں انسانیت، اخوت، شفقت اور اجتماعی ہمدردی کی ایسی عظیم مثالیں بھی دیکھنے کو ملیں جنہوں نے اُن کے دل میں زندگی کے روشن پہلوؤں پر یقین کو دوبارہ زندہ رکھا۔ علی گڑھ کی فضا، جو چند روز قبل اُن کے لیے محض ایک تعلیمی دنیا تھی، اب اُنہیں ایک ایسے روحانی اور جذباتی حصار کی مانند محسوس ہونے لگی جہاں اُن کے دکھ کو پوری یونیورسٹی اپنا دکھ سمجھ رہی تھی۔

درحقیقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یہی وہ انفرادیت، کشش اور روحانی وفکری عظمت تھی جس نے حضرت والدِ گرامی کی شخصیت پر نہایت گہرے اور دیرپا نقوش ثبت کیے۔ زندگی کے اُس دور میں جب وہ برادرِ عزیز کی المناک وفات، اور مختلف ذہنی و جذباتی آزمائشوں سے گزر رہے تھے، اُس وقت بظاہر حالات اُن کے حوصلوں کو متزلزل کرنے کے لیے کافی تھے، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا علمی، تہذیبی اور تربیتی ماحول اُن کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ ثابت ہوا جہاں مایوسی کے بجائے امید، شکستگی کے بجائے حوصلہ، اور اضطراب کے بجائے عزم و استقلال کی فضا موجود تھی۔

حضرت والدِ گرامی اکثر محسوس فرمایا کرتے تھے کہ علی گڑھ کی فضا میں ایک عجیب سی زندگی بخش تاثیر موجود تھی۔ جب کبھی ذہن غموں کے بوجھ تلے دب جاتا، یا دل ماضی کے صدمات سے بوجھل ہو جاتا، تو جامعہ کی علمی نشستیں، طلبہ کی سرگرمیاں، ادبی محافل، اساتذہ کی صحبت، اور

کیمپس کی متحرک فضا اُن کے اندر ایک نئی توانائی اور تازہ عزم پیدا کر دیتی۔ گویا یہ ادارہ محض علم کا مرکز نہیں بلکہ خوابوں کو حقیقت میں ڈھالنے اور شکستہ دلوں کو نئی امید عطا کرنے کی ایک زندہ درسگاہ تھا۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران حضرت والدِ محترم کو زندگی کے بے شمار ایسے ابواب سے گزرنے کا موقع ملا جنہوں نے اُن کی شخصیت میں فکری پختگی، وسیع النظری، خود اعتمادی اور مقصدیت پیدا کی۔ مختلف تہذیبوں، مختلف علاقوں اور مختلف مزاجوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے ساتھ رہنے سے اُن کی سوچ کے دائرے وسیع ہوئے اور اُنہوں نے زندگی کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنا سیکھا۔

اسی دوران اُنہیں متعدد علمی، ادبی، سماجی اور قومی شخصیات کی زیارت، ملاقات اور خطابات سے استفادہ کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان عظیم شخصیات کی گفتگو، اُن کے افکار، اُن کے طرزِ عمل اور اُن کی کامیابیوں کی داستانوں نے حضرت والدِ گرامی کے دل میں بلند مقاصد کے حصول کا جذبہ مزید مستحکم کر دیا۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ انسان کے لیے حالات کی سختیاں کامیابی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوتیں، بلکہ اصل چیز عزم، محنت، استقامت اور صحیح سمت میں مسلسل جدوجہد ہے۔

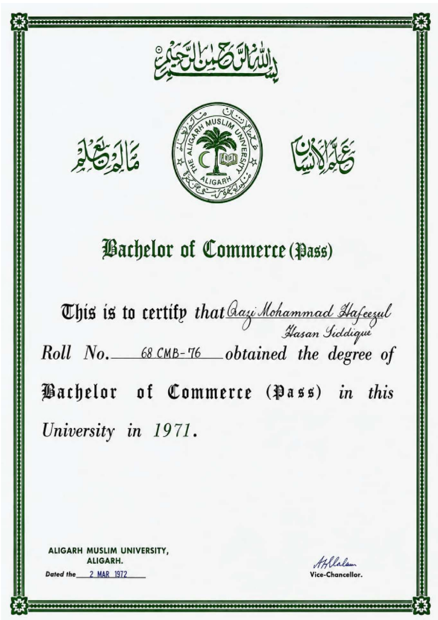
جامعہ کے علمی ماحول نے اُن کے اندر یہ یقین راسخ کر دیا کہ زندگی کی عظمت کا دارومدار محض موروثی حیثیت یا مالی آسودگی پر نہیں بلکہ علم، کردار، نظم وضبط اور مسلسل محنت پر ہے۔ یہی وہ سبق تھا جو بعد میں اُن کی پوری عملی زندگی میں نمایاں نظر آیا، خواہ وہ تعلیم کا میدان ہو، پیشہ ورانہ زندگی ہو، خاندانی ذمہ داریاں ہوں، یا دینی وسماجی خدمات کا باب۔

حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی حضرت والدِ گرامی کے لیے صرف ایک تعلیمی ادارہ نہ رہی بلکہ اُن کی شخصیت کی تعمیر، اُن کے افکار کی تشکیل، اور اُن کے مستقبل کے خوابوں کی آبیاری کا ایک عظیم سرچشمہ ثابت ہوئی۔ اگر اُن کی زندگی کے اہم موڑوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ علی گڑھ نے اُنہیں صرف تعلیم نہیں دی، بلکہ اُنہیں خود شناسی، مقصد شناسی، اور کامیاب زندگی کا شعور عطا کیا۔

یوں جامعہ علی گڑھ کے وہ سال حضرت والدِ محترم کی حیات کے اُن سنہری اور فیصلہ کن ادوار میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ایک حساس، آزمودہ اور صدمات سے گزرے ہوئے نوجوان کو ایک پُرعزم، باوقار، تعلیم یافتہ اور کامیاب شخصیت میں ڈھالنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قیام کے اُن یادگار ایام کے دوران حضرت والدِ گرامی علم وعمل کے میدان میں مسلسل ارتقاء کے مراحل طے کر رہے تھے۔ ابتدائی تعلیمی کامیابیوں کے بعد انہوں

نے نہایت انہماک، سنجیدگی اور علمی شوق کے ساتھ بی۔کام (B.Com) کی ڈگری حاصل کرنے کا سفر جاری رکھا، اور پھر اسی یونیورسٹی سے ایم۔کام (M.Com) کی تعلیم کے لیے بھی خود کو وقف کر دیا۔ اُن کی علمی زندگی محض رسمی تعلیم تک محدود نہ تھی بلکہ اُس میں مقصدیت، خودسازی، اور مستقبل کی بلند پروازیوں کا ایک روشن شعور نمایاں تھا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم الانسان ما لم یعلم

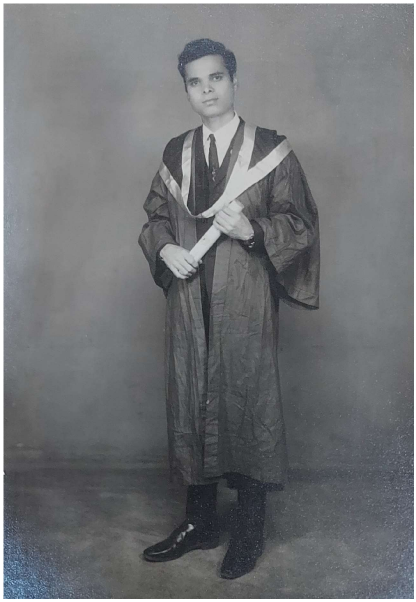
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

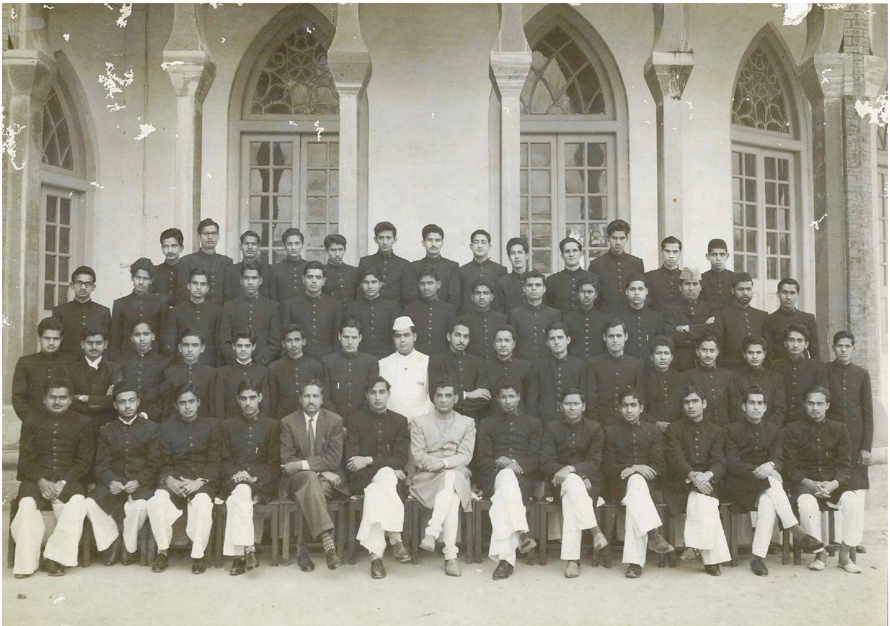
Bachelor of Commerce (Pass)

This is to certify that *Qazi Mohammad Hafeezul Hasan Siddique*
Roll No. *68 CMB-76* obtained the degree of
Bachelor of Commerce (Pass) in this University in 1971.

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.
Dated the 2 MAR 1972

Vice-Chancellor.





۱۹۷۲ کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ کامرس کے طلبہ کی ایک یادگار اور تاریخی تصویر

اس تصویر میں محترم والد گرامی اوپر سے دوسری صف میں، دائیں جانب سے چھٹے مقام پر موجود ہیں

مسرت وشادمانی

علی گڑھ کی علمی وتہذیبی فضا میں رہتے ہوئے بھی حضرت والدِ محترم کے قلب میں اپنے آبائی وطن اور خاندانی وابستگیوں کی محبت ہمیشہ پوری شدت کے ساتھ زندہ رہی۔ چنانچہ وہ وقفے وقفے سے اپنے وطنِ عزیز گلبرگہ تشریف لایا کرتے، جہاں قلعہ حشام کے قدیم وپُر وقار ماحول میں واقع اپنے گھر کی فضائیں اُن کے لیے سکون، اور قلبی راحت کا سرچشمہ بن جاتیں۔ اپنے برادرانِ اکابر اور عزیز ہمشیرہ کے ساتھ گزارے گئے وہ لمحات اُن کے لیے نہایت قیمتی، یادگار اور روح پرور ہوتے۔ گھریلو نشستیں، محبت بھری گفتگوئیں، خاندانی شفقت، اور ماضی کی یادوں سے معطر وہ ماحول اُن کے تھکے ہوئے دل ودماغ کو ایک نئی تازگی عطا کرتا۔



وقت کا کارواں آگے بڑھتا رہا اور پھر قدرتِ الٰہی نے اس خانوادۂ کریمہ کو ایک طویل عرصہ آزمائش وحزن کے بعد مسرت وشادمانی کے ایسے مبارک ایام عطا فرمائے جنھوں نے گھر کی فضاؤں کو ایک بار پھر خوشیوں اور دعاؤں کی روشنی سے منور کر دیا۔ یہ وہ بابرکت مرحلہ تھا جب حضرت والدِ گرامی کے دوسرے بڑے بھائی (معظم تایا صاحب) اور اُن کی عزیز ہمشیرہ (مسرت پھوپھی صاحبہ) کے عقدِ ازدواج کی مبارک تقریبات منعقد ہوئیں۔ یہ محض خاندانی رسومات نہ تھیں بلکہ اُن صبر آزما برسوں کے بعد عطا ہونے والی وہ خوشیاں تھیں جن کا ہر فردِ خاندان شدت سے منتظر تھا۔

سنہ ۱۹۶۷ء میں گھر کا ہر گوشہ مسرتوں سے جگمگا اٹھا، دعاؤں کی صدائیں بلند ہوئیں، اور رشتہ داروں و متعلقین کی آمد ورفت نے فضا کو جشن وانبساط سے بھر دیا۔ خصوصاً حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے بھائی، جناب فاروق تایا صاحب جنھوں نے والدانہ شفقت، ایثار اور قربانی کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کی پرورش اور ذمہ داریوں کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا، اُن کے چہرے پر اُس وقت ایک خاص قسم کا قلبی اطمینان اور مسرت نمایاں تھی۔ گویا وہ اپنی حیات کی ایک عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر سکون کا سانس لے رہے ہوں۔

حضرت والدِ گرامی کی محبّ ہمشیرہ کا رشتہ گلبرگہ شریف کے عظیم دینی، علمی اور قضاۃ خانوادے میں طے پایا۔ یہاں یہ امر بھی نہایت قابلِ ذکر ہے کہ جناب صدر قاضی صاحب دراصل

حضرت والدِ گرامی کے والدِ محترم کے سب سے بڑے بھائی تھے، جو خاندان میں نہایت احترام اور عقیدت کے ساتھ پاشوطیبہ کے نام سے معروف تھے۔ وہ اپنے علم، وقار، دینی بصیرت، خاندانی عظمت، اور روحانی اثر و رسوخ کے اعتبار سے نہ صرف خاندان بلکہ پورے شہر میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت قضاۃ کے اُس معزز سلسلے کی نمائندہ تھی جس نے نسل در نسل دینی خدمت، شرعی رہنمائی، اور سماجی وقار کو اپنے کردار کا حصہ بنائے رکھا۔

اسی گھرانے سے تعلق رکھنے والی نہایت باوقار اور جلیل القدر شخصیت، نائب قاضی جناب قاضی محمد حسین صدیقی صاحب المعاروف قادر پاشاہ صاحب، (جو میرے پھوپھا حضرت ہوتے ہیں) اپنی ذات میں ایک مکمل باب، ایک مستقل تاریخ، اور ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شخصیت، خدمات، علم، وقار، ذہانت، دینی شعور، سماجی اثر، اور اخلاقی عظمت پر اگر تفصیل سے قلم اٹھایا جائے تو شاید اُس کے لیے ایک مستقل جلد بھی ناکافی محسوس ہو۔ وہ اُن نادر شخصیات میں شمار ہوتے تھے جن کی موجودگی خود ایک ادارہ محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے علم میں وقار، گفتگو میں متانت، فیصلوں میں حکمت، اور شخصیت میں ایسا رعب و احترام پایا جاتا تھا جو ہر ملنے والے کو متاثر کیے بغیر نہ رہتا۔ خاندان، شہر، اور دینی حلقوں میں اُنہیں نہایت عزت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کی ذات گویا علم، شرافت، تہذیب، خاندانی عظمت، اور خدمتِ دین کا حسین امتزاج تھی۔

چنانچہ جب حضرت والدِ گرامی کی محبّ ہمشیرہ کی نسبت اس عظیم گھرانے میں طے پائی تو یہ محض ایک رشتہ نہ تھا بلکہ باعثِ فخر، سعادت اور اعزاز کا ایک نہایت بلند مقام تھا۔ والدِ محترم کا پورا گھر اس نسبت پر خوشی، تشکر اور قلبی مسرت محسوس کر رہا تھا کہ اُن کی بہن ایک ایسے معزز، علمی، دینی اور باوقار گھرانے میں رخصت ہو رہی ہیں جس کا نام خود شہر کی تاریخ اور روحانی روایتوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔

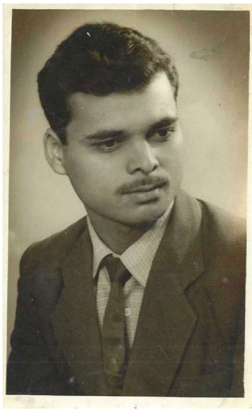
اسی مبارک اور خوشیوں بھرے ماحول میں حضرت والدِ گرامی کے دوسرے بڑے بھائی (معظم تایا ابا) کی شادی بھی طے پائی۔ اُن کی نسبت بڑے بھائی کی اہلیہ، یعنی محترمہ بھابھی جان کی خالہ زاد بہن کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔ یوں خاندان میں ایک اور محبت بھرا، خوشگوار اور مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔

دوسری بھابھی جان (جو انور بھابھی کے نام سے جانے جاتے رہے) کی آمد بھی، گھر کے لیے نہایت خوش آئند ثابت ہوئی۔ اُن کی شخصیت میں اپنائیت، خلوص، ملنساری، خدمت گزاری، اور گھریلو محبت کی ایسی دلنشیں کیفیت موجود تھی جس نے بہت کم عرصے میں گھر کے ماحول کو مزید خوشگوار، منظّم اور محبتوں سے بھر دیا۔ وہ نہایت دوستانہ مزاج، نرم گفتگو، اور تعاون کرنے والی خاتون تھیں، جو ہر فرد کے ساتھ محبت، احترام اور بے تکلفی کے ساتھ پیش آتیں۔

اُن کی آمد سے گویا گھر کی فضا میں ایک نئی تازگی، رونق اور نسوانی شفقت کا اضافہ ہو گیا۔ خاندان کے افراد اُن سے نہایت مانوس ہو گئے، اور اُنہوں نے اپنے حسنِ اخلاق، گھریلو تدبر، اور مددگار طبیعت کے ذریعے جلد ہی سب کے دلوں میں ایک مستقل مقام بنا لیا۔

یوں یہ دونوں مبارک رشتے نہ صرف خاندانی وسعت کا سبب بنے بلکہ اُنہوں نے خاندان کے ماحول میں محبت، وقار، خاندانی اتحاد، اور تہذیبی وابستگیوں کو مزید مضبوط اور مستحکم کر دیا۔

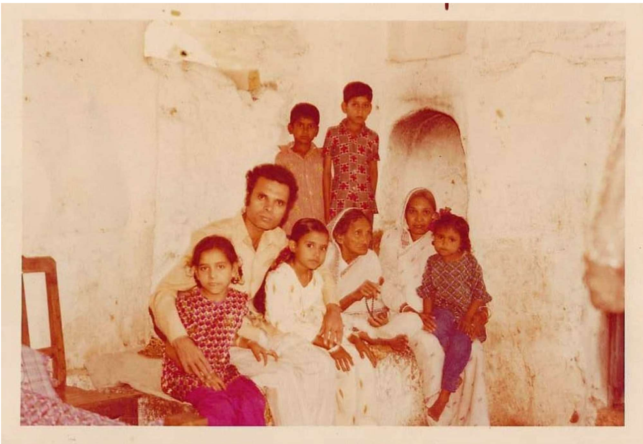
حضرت والدِ گرامی اُس زمانے میں شبابِ عمر کی پوری رعنائیوں، ذہانت، وجاہت اور غیر معمولی اعتماد کے حامل تھے۔ اُن کی شخصیت میں علم کی سنجیدگی، جوانی کی تازگی، خاندانی وقار اور مستقبل کے بلند عزائم کا حسین امتزاج نمایاں تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایسے موڑ پر کھڑے تھے جہاں ماضی کی آزمائشوں نے اُنہیں پختہ بنا دیا تھا، اور مستقبل اُنہیں نئے چیلنجز، نئی ذمہ داریوں اور وسیع تر امکانات کی جانب دعوت دے رہا تھا۔



یوں ایک طویل عرصہِ غم، جدائی اور آزمائش کے بعد قدرتِ حق نے اس خاندان کو نئے رشتوں، نئی مسرتوں اور نئی امیدوں کی صورت میں وہ نعمتیں عطا فرمائیں جنھوں نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنا شروع کر دیا۔ یہ خوشیاں صرف تقریبات کی حد تک محدود نہ تھیں بلکہ یہ اس بات کی علامت تھیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو صبر کے طویل صحرا کے بعد رحمتوں اور مسرتوں کی ایسی بہار عطا فرماتا ہے جو زندگی کے زخموں پر سکون کا مرہم بن جاتی ہے۔

قدرتِ الٰہی کے فضلِ عمیم اور رحمتِ بے کراں سے رفتہ رفتہ اس خانوادہِ معزز کی زندگی میں استحکام، وسعت اور نئی خوشیوں کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حضرت والدِ گرامی کے برادرانِ اکابر اور عزیز ہمشیرہ کے شادی کے بعد گھر کا محدود دائرہ ایک بار پھر محبتوں، رشتوں اور نئی نسل کی معصوم مسکراہٹوں سے آباد ہونے لگا۔ ننھے بھتیجوں اور بھانجوں کی آمد نے گھر کی فضاؤں میں ایسی دلآویز شگفتگی پیدا کر دی کہ مدتوں کے غم و اندوہ کے بعد یہ آشیانہ دوبارہ کھلکھلاہٹ، معصوم شرارتوں اور خاندانی اپنائیت کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

حضرت والدِ گرامی بھی اپنے بھتیجوں اور بھانجوں سے نہایت والہانہ محبت فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی معصوم حرکات، بچکانہ شوخیاں اور بے ساختہ مسکراہٹیں حضرت والدِ محترم کے قلب میں ایک خاص روحانی مسرت اور قلبی سکون پیدا کرتی تھیں۔ گویا زمانے کی سختیوں نے اُن کے دل میں جو خلا پیدا کیے تھے، یہ ننھی ننھی خوشیاں اُن پر خاموشی سے محبت کا مرہم رکھ رہی تھیں۔



کھڑے ہوئے: فیصل بھائی صاحب، مکرم بھائی صاحب

تشریف فرماء: زیبا آپی، والد محترم کے بڑے پھوپھو جان صاحبہ، والد محترم کے دادی جان صاحبہ، انجم آپی، والد محترم، بشریٰ آپی

ایک نکتہ کی وضاحت

یہاں ایک امر کی وضاحت نہایت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ اس پوری داستانِ حیات میں حضرت دادا جان اور بعدازاں قائم ہونے والے اُن کے دوسرے خانوادے کی جانب سے حضرت والدِ گرامی کی عملی سرپرستی، جذباتی وابستگی یا تربیتی کردار کا تفصیلی ذکر نسبتاً کم دکھائی دیتا ہے۔اس اختصار کا مقصد ہرگز کسی کی شخصیت یا مقام کی تنقیص نہیں، بلکہ محض اُن حقیقی حالات و کیفیات کی عکاسی ہے جن کے زیرِ اثر حضرت والدِ محترم کی شخصیت نے نشو ونما پائی۔

اگرچہ حضرت والدِ گرامی اپنے والدِ محترم (یعنی میرے دادا جان) اور نئے خانوادے کے ساتھ ایک ہی گھر اور ایک ہی خاندانی فضا میں مقیم رہے، تاہم طرزِ فکر، مزاجی اختلافات، گھریلو ترجیحات اور بعض داخلی معاملات کے باعث ایک غیر محسوس فاصلہ ہمیشہ موجود رہا۔ان اختلافات کی نوعیت بظاہر خاموش تھی، لیکن اُن کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ حضرت والدِ گرامی اور اُن کے برادرانِ اکابر نے رفتہ رفتہ خود کو اُن معاملات اور گھریلو وابستگیوں سے الگ تھلگ رکھنے کو ہی اپنے سکون، وقار اور باطنی استحکام کے لیے زیادہ مناسب سمجھا۔

حضرت والدِ محترم کی طبیعت میں ابتدا ہی سے خودداری، حساسیت اور غیر معمولی عزتِ نفس پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی مشکلات، اپنی فکری الجھنوں اور اپنے مستقبل کے معاملات میں دوسروں پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً اُنہیں اس حقیقت کا مکمل شعور تھا کہ حضرت دادا جان اپنی دوسری ازدواجی زندگی، اُس سے وابستہ اہلِ خانہ، اور اُن کے وسیع تر تقاضوں و ذمہ داریوں میں پہلے ہی غیر معمولی طور پر مشغول اور فکرمند رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت والدِ گرامی نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ اُن کی ذات، اُن کا مستقبل، یا اُن کی جدوجہد حضرت دادا جان کے لیے مزید فکری بوجھ یا اضطراب کا باعث بنے۔

اسی احساسِ خودداری اور خاموش وقار کے تحت حضرت والدِ محترم نے اپنی زندگی کے بیشتر فیصلوں، اپنی تعلیمی جدوجہد، اپنی عملی مشکلات، اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں زیادہ تر اپنے برادرانِ اکابر، اپنے قریبی مخلص رشتہ داروں، اور اپنی ذاتی قوتِ ارادی پر انحصار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوانحی تذکرے میں حضرت دادا جان کا کردار پس منظر میں محسوس ہوتا ہے، کیونکہ حضرت والدِ گرامی کی عملی اور جذباتی زندگی کے بیشتر مراحل اُن راستوں پر طے ہوئے جہاں اُنہوں نے خاموشی، صبر، خودانحصاری اور برادرانہ سہاروں کے ساتھ اپنی دنیا خود ترتیب دی۔

اس کے باوجود خاندانی احترام، بزرگوں کے ادب، اور نسبی تعلق کی حرمت ہمیشہ حضرت والدِ گرامی کے مزاج اور کردار کا حصہ رہی۔ انہوں نے کبھی شکوہ، بدگمانی یا تلخی کو اپنی طبیعت پر غالب نہ آنے دیا، بلکہ زندگی کے تمام نشیب و فراز کو خاموش متانت، فکری پختگی اور تقدیرِ الٰہی پر رضا کے جذبے کے ساتھ قبول کیا۔ یہی اُن کی شخصیت کا وہ بلند ترین وصف تھا جس نے اُنہیں آزمائشوں کے باوجود وقار، شرافت اور باطنی استحکام کی روشن مثال بنائے رکھا۔

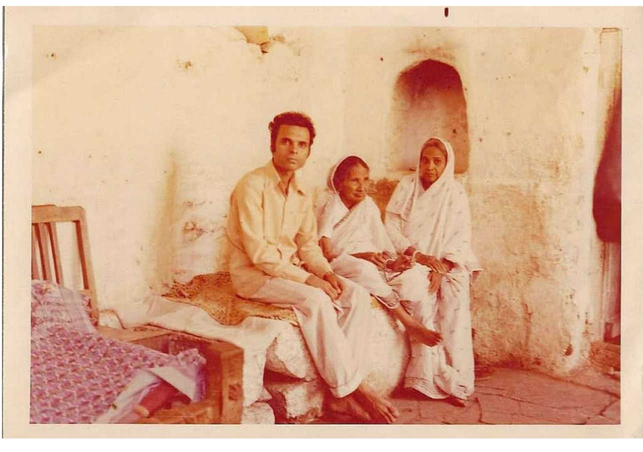
تکمیلِ تعلیم اور نئی راہیں

جیسا کہ ذکر گزر چکا کہ اس دوران خاندان میں نئے رشتوں کی آمد اور برادرانِ اکابر کی اولاد کی صورت نئی نسل کا آغاز خاندانی فضا میں تازہ مسرتوں، قلبی وابستگیوں اور زندگی کی نئی رعنائیوں کا سبب بن رہا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ حضرت والدِ گرامی کی تعلیمی مسافت اورعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علمی زندگی بھی تدریجاً اپنے اختتامی مراحل کی جانب رواں دواں تھی۔ بالآخر سنہ ۱۹۷۳ء میں حضرت والدِ گرامی نے اپنی اعلیٰ تعلیمی مسافت کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اپنے تعلیمی آشیانہ، علی گڑھ کو اشکبار قلب سے الوداع کہہ دیا۔ یہ اُن کی حیات کا ایک اہم سنگِ میل تھا، جہاں وہ علم و تربیت کے مراحل عبور کر کے عملی دنیا، معاشی جدوجہد اور پیشہ ورانہ زندگی کے نئے میدانوں میں قدم رکھنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہو چکے تھے۔ اُن کی شخصیت اب سنجیدگی، تعلیم، خاندانی وقار اور وسیع تجربات کے حسین امتزاج کی آئینہ دار بن چکی تھی، اور اُن کے سامنے مستقبل کے امکانات اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے تھے۔

تاہم زندگی کے عملی تقاضے ہمیشہ خواہشات کے تابع نہیں ہوتے۔ اگرچہ حضرت والدِ محترم صلاحیت، تعلیم اور بلند حوصلگی کے اعتبار سے ایک روشن مستقبل کے مستحق تھے، مگر معاشی تنگی

اور محدود وسائل نے فوری طور پر اُنہیں وسیع تر ملازمت کے مواقع تلاش کرنے کی مکمل آزادی نہ دی۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک وہ اپنے برادرانِ اکابر اور اُن کے اہلِ خانہ کے ہمراہ گلبرگہ میں قیام پذیر رہے۔

یہ دور اگرچہ بظاہر انتظار اور محدود امکانات کا زمانہ تھا، لیکن درحقیقت یہی وہ مرحلہ تھا جہاں حضرت والدِ گرامی نے خاندانی تعلقات کی حرارت، صبر و استقامت کی قوت، اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ رکھنے کا عملی شعور مزید گہرائی کے ساتھ حاصل کیا۔ وہ خاموشی، وقار اور مثبت فکر کے ساتھ مستقبل کے دروازے کھلنے کے منتظر رہے، کیونکہ اُن کے مزاج میں بے صبری یا مایوسی کے بجائے امید، تدبر اور اللہ تعالیٰ کی حکمت پر کامل یقین تھا۔



والد صاحب کے بڑے پھوپھو جان صاحبہ، والد صاحب کے دادی جان صاحبہ، محترم والد صاحب

حجاز کا سفر

سنہ ۱۹۷۴ء میں تقدیر نے اُن کی زندگی میں ایک نہایت اہم، غیر متوقع اور بابرکت موڑ پیدا کیا۔ حضرت والدِ گرامی کے نہایت مشفق، فیاض اور خیر خواہ چچا، جناب محمد حمایت المقیت صدیقی صاحب، ایک ایسی رحمت وعنایت کے ساتھ سامنے آئے جس نے حضرت والدِ محترم کی زندگی کے افق کو ایک نئی وسعت عطا کردی۔ اُنہوں نے نہ صرف حضرت والدِ گرامی کو سرزمینِ حجاز کی مقدس حاضری اور فریضہ حج کی سعادت حاصل کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اس مبارک سفر کے مالی اخراجات اور انتظامات کی کفالت بھی نہایت فراخ دلی اور محبت کے ساتھ اپنے ذمے لے لی۔

یوں حضرت والدِ گرامی کو اپنے دادی جان اور بڑی پھوپھو جان کی معیت میں حجازِ مقدس کے روح پرور سفر کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ سفر محض ایک مذہبی فریضے کی ادائیگی نہ تھا بلکہ درحقیقت اُن کی شخصیت، فکر اور مستقبل کے لیے ایک نئے جہان کے دروازے کھلنے کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ وطن کی حدود سے نکل کر بین الاقوامی ماحول، مختلف اقوام، نئی تہذیبوں اور عالمِ اسلام کی وسیع تر دنیا سے تعارف نے اُن کے شعور کو نئی جہات عطا کیں۔

گویا قدرتِ الٰہی نے ایک ایسے وقت میں، جب ظاہری اسباب محدود دکھائی دیتے تھے، اپنے خاص فضل و کرم سے حضرت والدِ گرامی کے لیے ایک ایسا راستہ کھول دیا جس نے نہ صرف اُن کی روحانی دنیا کو منور کیا بلکہ اُن کی عملی زندگی کے افق پر بھی نئے امکانات اور نئے خواب روشن کر دیے۔

سرزمینِ حجاز کے اس مبارک اور روح پرور سفر نے حضرت والدِ گرامی کی حیات میں ایک ایسا انقلابِ باطن برپا کیا جس کی گہرائی، تاثیر اور روحانی کیفیت کو الفاظ کے محدود پیمانوں میں سمو دینا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ محض ایک سفر نہ تھا بلکہ روح کی تطہیر، قلب کی بیداری اور بندہ مؤمن کے اپنے خالقِ حقیقی سے ایک عمیق روحانی ربط کا ایسا تجربہ تھا جس نے حضرت والدِ محترم کے فکر و شعور کو ہمیشہ کے لیے ایک نئی جہت عطا کر دی۔

حضرت والدِ گرامی نے اس مقدس سفر کا آغاز بحری جہاز کے ذریعے کیا۔ اُس زمانے میں حج کا سفر آج کی طرح تیز رفتار اور آرام دہ نہ تھا بلکہ صبر، استقامت، مشقت اور غیر معمولی حوصلے کا متقاضی سمجھا جاتا تھا۔ وسیع و عریض سمندر کی موجوں کو چیرتا ہوا وہ بحری سفر گویا اُنہیں رفتہ رفتہ دنیاوی ہنگاموں سے جدا کر کے ایک روحانی کائنات کی طرف لے جا رہا تھا۔ ہر گزرتا دن، ہر اُبھرتی موج، اور ہر بدلتا منظر اُن کے قلب میں ایک نئی کیفیتِ شوق و خشوع پیدا کر رہا تھا۔



والد صاحب کے بڑے پھوپھو جان صاحبہ، والد صاحب کے دادی جان صاحبہ، محترم والد صاحب



معظم تایا ابا صاحب اور مبشر بھائی، مکرم بھائی، محترم والد صاحب، محترم دادا حضرت صاحب، احسن چاچا،

ذکی چاچا، فاروق تایا ابا صاحب

جب حضرت والدِ گرامی جدہ پہنچے اور پھر دادی جان اور بڑی پھوپھو جان کی معیت میں مناسکِ حج کی ادائیگی کے لیے مقدس مقامات کی جانب روانہ ہوئے، تو اُن کے قلب وروح پر ایسی نورانی کیفیات طاری ہوئیں جنھوں نے اُن کی داخلی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسجد الحرم کی ہیبت و روحانیت، کعابہ مشرفہ کے دیدار کی لرزہ خیز سعادت، مسجد نبوی کی سکون آفریں فضائیں، اور ان مقدس سرزمینوں کے ہر ذرّے سے پھوٹتی ہوئی روحانی تاثیر نے اُن کے قلب کو ایک ایسی کیفیتِ تسلیم ورضا سے بھر دیا جسے وہ زندگی بھر فراموش نہ کر سکے۔

حضرت والدِ محترم نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا کی تمام تر رنگینیاں، مصروفیات، کشمکشیں اور ظاہری کامیابیاں دراصل ایک عارضی سایہ ہیں، جبکہ انسان کی اصل حقیقت اُس کا اپنے رب سے تعلق، اُس کی بندگی، اور اُس کی روحانی پاکیزگی میں مضمر ہے۔ حجازِ مقدس کی اس نورانی حاضری نے اُنھیں حیات کے حقیقی مقصد، انسانی وجود کی فانی حقیقت، اور دنیا کی بے ثباتی کا ایسا شعور عطا کیا جس نے اُن کے طرزِ فکر، اُن کے مزاج اور اُن کی زندگی کے ترجیحات کو مزید متوازن، سنجیدہ اور با مقصد بنا دیا۔

اگرچہ اس زمانے کے حج کے سفر میں بے شمار دشواریاں، جسمانی تھکن، رہائشی مسائل، سفر کی صعوبتیں اور متعدد قسم کی مشقتیں شامل تھیں، لیکن حضرت والدِ گرامی کے قلب میں موجزن روحانی سکون اور باطنی سرشاری اس قدر غالب تھی کہ اُنھوں نے کبھی ان تکالیف کو بوجھ محسوس

نہ کیا۔ اُنہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے روح ایک ایسی لذتِ قربِ الٰہی سے سرشار ہو چکی ہے جس کے سامنے جسمانی مشقتوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ہر قدم عبادت بن چکا تھا، ہر دعا اشکوں میں ڈھل رہی تھی، اور ہر لمحہ قلب پر نورِ سکینت کی بارش کر رہا تھا۔

درحقیقت یہ سفر حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں محض ایک مذہبی فریضے کی ادائیگی نہ تھا بلکہ تقدیرِ الٰہی کی طرف سے اُن کی آئندہ زندگی کے لیے ایک روحانی تیاری اور باطنی تربیت کا عظیم مرحلہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قدرتِ حق نے اُنہیں عملی دنیا، معاشی جدوجہد، خاندانی ذمہ داریوں اور مستقبل کے بڑے مراحل میں داخل ہونے سے قبل اپنے دربار میں حاضری کی سعادت عطا فرمائی ہو، تاکہ وہ روحانی بالیدگی، قلبی سکون اور ایمان کی پختگی کے ساتھ زندگی کے اگلے باب کا آغاز کر سکیں۔

ملازمت کی جدوجہد

حجازِ مقدس سے واپسی کے بعد حضرت والدِ گرامی کی شخصیت میں ایک نمایاں سنجیدگی، روحانی وقار، فکری پختگی اور قلبی اطمینان مزید نمایاں ہو گیا۔ گویا یہ مبارک سفر اُن کی حیات کے پہلے تمام نشیب وفراز کا روحانی خلاصہ اور آئندہ آنے والے عظیم مرحلوں ـــــ یعنی عملی زندگی، معاشی جدوجہد اور خاندانی ذمہ داریوں ـــــ کے لیے ایک نورانی تمہید ثابت ہوا۔

چنانچہ انہی ایام میں اُن کے نہایت محترم، فیاض اور خیر خواہ چچا، جناب محمد حمایت المقیت صدیقی صاحب، جو اُس وقت جدہ میں برسرِ روزگار اور مقیم تھے، نے حضرت والدِ گرامی کے مستقبل کے متعلق نہایت سنجیدگی اور شفقت کے ساتھ غور فرمایا۔

جناب حمایت المقیت صاحب نہ صرف خاندانی محبت رکھنے والی شخصیت تھے بلکہ دور اندیشی، وسیع المشربی اور سرپرستانہ خلوص کے بھی حامل تھے۔ اُنہوں نے حضرت والدِ محترم کی صلاحیت، تعلیم، وقارِ شخصیت اور عملی استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنہیں اس بات پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ وہ دوبارہ سعودی عرب آئیں اور اپنے عملی مستقبل کی بنیاد اسی سرزمین پر استوار

کریں۔ اُنہوں نے نہ صرف زبانی حوصلہ افزائی کی بلکہ ہرممکن اخلاقی، مالی اورعملی تعاون کا یقین بھی دلایا۔

رفتہ رفتہ اُن کی مخلصانہ ترغیب، مشفقانہ رہنمائی اوراعتماد افروز گفتگو نے حضرت والدِ گرامی کے قلب میں ایک نئے عزم کو جنم دیا۔ چنانچہ بالآخر سنہ ۱۹۷۶ء کے اواخر میں حضرت والدِ محترم نے ایک پختہ ارادے اور روشن امید کے ساتھ دوبارہ سعودی عرب کا سفر اختیار کیا، اس نیت سے کہ اب زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھ کر اپنے مستقبل، اپنے خاندان اور اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا جائے۔

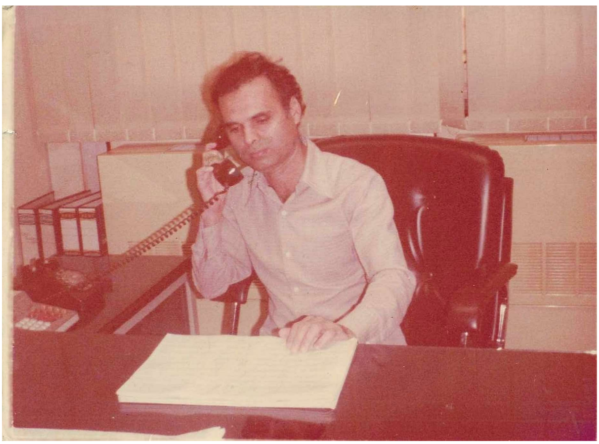
جب حضرت والدِ گرامی دوبارہ جدہ پہنچے تو ابتدائی ایام نہایت کٹھن اور آزمائشوں سے بھرپور تھے۔ اُس زمانے کا سعودی عرب آج کی طرح سہولیات، آسائشوں اور آسان ذرائع سے مزین نہ تھا۔ محدود وسائل، مالی تنگی، پردیس کی اجنبیت، زبان کی رکاوٹ، مختلف تہذیبی ماحول، اور ایک غیر مانوس معاشرے میں خود کو منوانے کی جدوجہد نے حضرت والدِ محترم کو بارہا سخت حالات سے دوچار کیا۔ بعض اوقات تنہائی کا احساس، بعض اوقات روزگار کی غیر یقینی کیفیت، کبھی محدود ذرائع کے باعث پیدا ہونے والی بے چینی اُن کے حوصلے کو آزمانے لگتی۔

لیکن حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کا امتیاز یہی تھا کہ وہ مشکلات کے سامنے ٹوٹنے کے بجائے مزید ثابت قدم ہو جاتے تھے۔ اُن کے محترم چچا جناب حمایت المقیت صاحب ہر مرحلے پر اُن کے لیے ایک مضبوط سہارا بنے رہے۔ انہوں نے نہایت خلوص اور دل سوزی کے ساتھ حضرت والدِ محترم کی رہنمائی فرمائی، مختلف اداروں میں سفارشات مہیا کیں، مواقع تلاش کیے، اور اُنہیں عملی دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں بھرپور مدد دی۔

اگرچہ ملازمت کی تلاش کے دوران کئی نشیب و فراز آئے، انتظار کی طویل گھڑیاں بھی آئیں، اور بعض اوقات حالات کی سختی، طبیعت میں اضطراب اور بے زاری بھی پیدا کرتی، مگر حضرت والدِ گرامی نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ اُن کے قلب میں بزرگوں کی دعائیں، اپنی محنت پر یقین، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر کامل اعتماد ہمیشہ زندہ رہا۔

پھر بالآخر سنہ ۱۹۷۷ء میں قدرتِ الٰہی نے اُن کی مسلسل جدوجہد کو ایک عظیم کامیابی سے نوازا۔ ایک دن حضرت والدِ گرامی کو سعودی عربین ائیر لائینس میں انٹرویو کا موقع ملا۔ یہ بظاہر ایک معمولی موقع تھا، لیکن درحقیقت اُن کی پوری زندگی کے ایک نئے باب کا دروازہ ثابت ہونے والا تھا۔ والدِ محترم نے اپنی تعلیم، وقار، ذہانت اور سنجیدہ طرزِ گفتگو سے ایسا مثبت تاثر قائم کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنی محنت کے طفیل انہیں بحیثیت اکاؤنٹنٹ (محاسب) ملازمت حاصل ہوگئی۔

یہ کامیابی حضرت والدِ گرامی کی زندگی کا ایک عظیم سنگِ میل تھی۔ گویا بچپن کی محرومیاں، نوجوانی کی آزمائشیں، تعلیمی جدوجہد، خاندانی قربانیاں اور برادرانِ اکابر کی طویل محنتیں بالآخر رنگ لے آئی تھیں۔ اس خوشخبری نے نہ صرف حضرت والدِ محترم کے دل کو مسرت و اطمینان سے بھر دیا بلکہ اُن کے برادرانِ اکابر کے چہروں پر بھی فخر، خوشی اور قلبی سکون کی ایسی روشنی بکھیر دی جس کا انتظار وہ برسوں سے کر رہے تھے۔ اب حضرت والدِ گرامی نے جدہ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ اُن کی زندگی ایک منظّم، باوقار اور ذمہ دارانہ معمول میں ڈھلنے لگی۔ وقت کی پابندی، دیانت داری، محنت اور خلوص اُن کی عملی زندگی کا شعار بن گئے۔ روزگار کے میدان میں اُن کی سنجیدگی، اخلاقی وقار اور مستقل مزاجی نے رفتہ رفتہ اُنہیں نہ صرف معاشی استحکام عطا کیا بلکہ ایک باوقار اور قابلِ اعتماد شخصیت کے طور پر بھی نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ یوں سرزمینِ حجاز، جو ابتدا میں اُن کے لیے اجنبیت، آزمائش اور جدوجہد کا استعارہ تھی، رفتہ رفتہ اُن کی کامیابی، استحکام اور روشن مستقبل کی بنیاد بن گئی۔



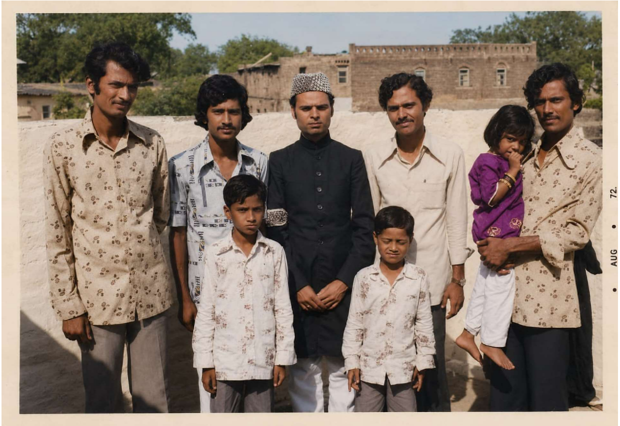
ازدواجی زندگی کا پُرنور باب

جب حضرت والدِ گرامی جدہ میں ایک باوقار ملازمت، منظّم طرزِ زندگی اور معاشی استحکام کے ساتھ اپنی عملی دنیا میں مستحکم ہو چکے، تو اُن کے برادرانِ اکابر، جو ہمیشہ اُن کی زندگی کے ہر اہم مرحلے میں خیر خواہی، دوراندیشی اور شفقت کے ساتھ رہنمائی فرماتے رہے تھے، اب اس فکر میں مبتلا ہوئے کہ حضرت والدِ محترم کی زندگی کو ایک مکمل، پُرسکون اور بابرکت خاندانی قالب بھی میسر آنا چاہیے۔ اُن کی نگاہ میں اب وقت آ چکا تھا کہ حضرت والدِ گرامی اپنی عملی کامیابیوں کے ساتھ ازدواجی زندگی کے پُرنور باب میں بھی داخل ہوں اور ایک ایسا رفیقِ حیات حاصل کریں جو اُن کی شخصیت، مزاج، اقدار اور روحانی و اخلاقی وقار کے شایانِ شان ہو۔

چنانچہ اہلِ خاندان میں مختلف تجاویز اور مشاورتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بزرگوں کی بصیرت، خاندانی روایات اور باہمی اعتماد کے ماحول میں بالآخر اُس مبارک نسبت کا انتخاب عمل میں آیا جو بعد کے ایام میں نہ صرف حضرت والدِ گرامی کی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ثابت ہوئی بلکہ سکون، محبت اور برکت کا ذریعہ بھی بنی۔ یہ سعادت حضرت والدِ محترم کی پھوپھی زاد محترمہ، لئیق زینت الاخلاق المعروف عشرت پروین صاحبہ (یعنی میری محترم والدہ) کے حصے میں آئی۔

یہ رشتہ درحقیقت قدرتِ خداوندی کا ایک عظیم انعام تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں شخصیات کو ایک دوسرے کے لیے خاص حکمت اور محبت کے ساتھ منتخب کیا گیا ہو۔ حضرت والدِ گرامی کی سنجیدگی، وقار، محنت اور ذمہ داری کے ساتھ محترمہ والدہ کی شفقت، سادگی، نظم و ضبط اور محبت آمیز طبیعت ایک ایسا حسین امتزاج بن گئی جس نے اُن کی ازدواجی زندگی کو سکون، ہم آہنگی اور قلبی طمانیت کا مرقع بنا دیا۔

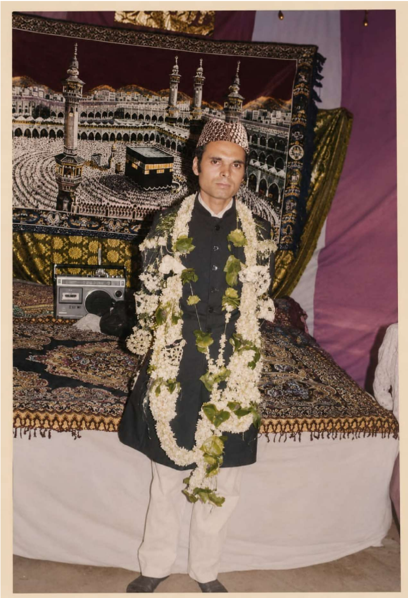
چنانچہ سنہ ۱۹۷۸ء بمقام اٹلکوٹ میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، بزرگوں کی دعاؤں اور خاندانی مسرتوں کے درمیان حضرت والدِ گرامی رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے اور یوں اُنہوں نے سنتِ نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے اپنے دین کا نصف مکمل کیا۔ یہ محض ایک نکاح نہ تھا بلکہ دو پاکیزہ روحوں، دو مخلص دلوں، اور دو باوقار خاندانوں کے درمیان محبت، اعتماد اور وفاداری کے ایک مبارک عہد کا آغاز تھا۔

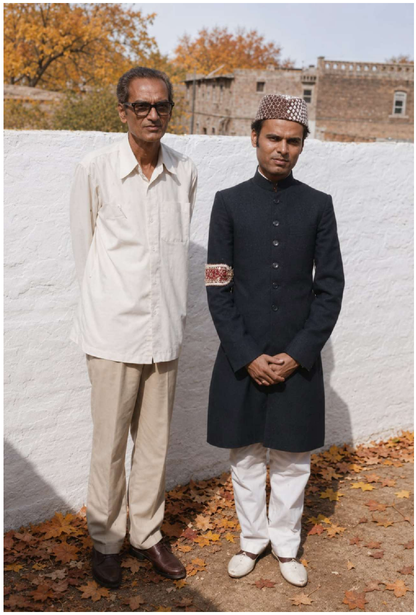


کوثر ماما،تمکینت آنٹی ،رئیس ماما، ناصر ماما،محترم والد صاحب،شفیق ماما،انیس ماما،سعید ماما



فاروق تایا ابا،مسعود بھائی،قالو جان صاحب،محترم والد صاحب،محترم دادا حضرت صاحب،
معظم تایا ابا،مسرت پاشاہ ماموں







فاروق تایا ابا صاحب، محترم والد صاحب، معظم تایا صاحب، چھوٹے تائی اماں، محترمہ والدہ صاحبہ، بڑے
تائی ماں صاحبہ، تشریف فرماء محترم دادا حضرت صاحب، محترمہ دادی بی صاحبہ

ازدواجی زندگی کے آغاز کے بعد حضرت والدِ گرامی کی شخصیت میں ایک نئی تازگی، مزید استحکام اور بڑھا ہوا جوشِ عمل نمایاں ہونے لگا۔ محترمہ والدہ کی محبت، رفاقت، دعاؤں اور خلوص بھرے تعاون نے اُن کے اندر زندگی کے نئے عزائم اور بلند تر حوصلوں کو مزید بیدار کر دیا۔ چنانچہ حضرت والدِ گرامی اپنی اہلیہ (میرے والدہ ماجدہ) کو اپنے ہمراہ جدہ لے گئے، جہاں دونوں نے مل کر اپنی ازدواجی زندگی کا ایک نہایت حسین، پُرسکون اور محبتوں سے بھرپور سفر شروع کیا۔ یوں سرزمینِ حجاز، جو کبھی حضرت والدِ گرامی کے لیے اجنبیت اور جدوجہد کی علامت تھی، اب محبت، سکون، نئی امیدوں اور ایک روشن مستقبل کی خوشبو سے مہکنے لگی۔



مشہود بھائی صاحب، فاروق تایا ابا صاحب، احسن چاچا، محترم والد صاحب، مبشر بھائی صاحب، مکرم بھائی صاحب، معظم تایا ابا صاحب، فیصل بھائی صاحب

اس داستانِ حیات کو آگے بڑھانے سے قبل یہ نہایت ضروری بلکہ اخلاقی و قلبی تقاضا ہے کہ اُس عظیم المرتبت، باوقار اور سراپا شفقت ہستی کا تذکرہ نہایت ادب، عقیدت اور تفصیل کے ساتھ کیا جائے جن کی موجودگی نے حضرت والدِ گرامی کی زندگی کو سکون، محبت، استحکام اور حقیقی معنوں میں ایک مکمل خانوادگی وقار عطا کیا۔ کیونکہ اگر حضرت والدِ محترم اس داستان کے مرکزِ عزم و استقامت ہیں، تو محترمہ والدہ ماجدہ اس داستان کی روح، اس کے احساسات کی لطافت، اور اس گھرانے کی اصل طمانیت تھیں۔ اُن کے ذکر کے بغیر اس سرگزشت کا بیان یقیناً نامکمل اور ادبی اعتبار سے بے حد ناانصافی تصور ہوگا۔

میری والدہ ماجدہ ایسی نفیس، باحیا، باوقار اور سیرت و کردار کی جامع خاتون تھیں جن کی شخصیت بیک وقت مشرقی تہذیب، خاندانی شرافت، دینی سادگی اور نسوانی عظمت کا ایک حسین مرقع محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے چہرے کی متانت، تبسم کی دلآویزی، گفتگو کی نرمی، اور طبیعت کی شگفتگی ہر اُس شخص کے دل میں احترام اور اپنائیت پیدا کر دیتی تھی جو اُن کے قریب آتا۔ لیکن اُن کی اصل خوبصورتی ظاہری وجاہت سے کہیں زیادہ اُن کے باطن، اُن کے اخلاق، اُن کے صبر، اور اُن کے بے مثال خلوص میں پوشیدہ تھی۔

وہ خاندان کی اُن نادر خواتین میں شمار ہوتی تھیں جن کی موجودگی محض ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پورے ماحول کی تہذیب، ترتیب اور سکون کی علامت بن جاتی ہے۔ اُن کی

طبیعت میں غیر معمولی نظم وضبط، سلیقہ شعاری، خاموش وقار، عاجزی، اور بے لوث خدمت کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا تھا کہ اہلِ خاندان اُنہیں احترام، محبت اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ نہایت منکسر المزاج، کم گو مگر گہرے شعور کی حامل خاتون تھیں، جنہوں نے کبھی اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے کردار، اپنے عمل، اور اپنی محبت کے ذریعے دوسروں کے دل جیتے۔

محترمہ والدہ ماجدہ کی سب سے نمایاں صفت اُن کی بے مثال شفقت اور دوسروں کے لیے جینے کا جذبہ تھا۔ اُن کے قلب میں خاندان، عزیز واقارب اور بالخصوص حضرت والدِ گرامی کے لیے ایسی خالص محبت موجزن تھی جس میں نمود ونمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اپنی ذات کی آسائشوں سے زیادہ دوسروں کے سکون، خوشی اور اطمینان کو اہمیت دیتیں۔ اُن کے مزاج میں قربانی اس قدر رچی بسی تھی کہ وہ خاموشی سے ہر ذمہ داری نبھاتیں، ہر مشکل برداشت کرتیں، اور ہر آزمائش میں اپنے صبر وتحمل سے گھر کے ماحول کو بکھرنے سے بچائے رکھتیں۔

میری والدہ محترمہ نہایت منظّم، سلیقہ شعار اور ادب واحترام کی پیکر خاتون تھیں۔ حضرت والدِ گرامی کے لیے وہ محض ایک شریکِ حیات نہ تھیں بلکہ ایک مخلص رفیقہ، غمگسار، حوصلہ بخش ساتھی، اور زندگی کے ہر نشیب وفراز میں وفا واخلاص کا روشن مینار ثابت ہوئیں۔ انہوں نے نہ صرف ایک وفا شعار شریکِ حیات کا کردار ادا کیا بلکہ ہر مرحلے میں حضرت والدِ محترم کی

جذباتی قوت، قلبی سکون اور عملی استحکام کا ذریعہ بھی بنیں۔ جب حضرت والدِ گرامی عملی زندگی کی جدوجہد، پردیس کی مشقتوں اور ذمہ داریوں کے مراحل سے گزر رہے تھے، تو محترمہ والدہ کی دعائیں، حوصلہ افزائی، محبت بھرا تعاون اور خاموش وفاداری اُن کے لیے ایک ایسی روحانی طاقت بن گئی جس نے اُنہیں ہمیشہ تازہ حوصلہ عطا کیا۔

وہ اپنی سادگی میں عظمت، اپنی خاموشی میں حکمت، اپنی عاجزی میں وقار، اور اپنی محبت میں ایک کامل نسوانی تقدس رکھتی تھیں۔ اُن کی شخصیت میں تصنع، بناوٹ یا خودنمائی کا کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ جتنی حسین صورت کی مالک تھیں، اُس سے کہیں زیادہ حسین اُن کا کردار، اُن کی نیت اور اُن کا باطن تھا۔ اُنہوں نے اپنے اخلاق، اپنے صبر، اپنی دعاؤں اور اپنی بے لوث محبت کے ذریعے نہ صرف حضرت والدِ گرامی کی زندگی کو سنوارا بلکہ پورے خاندان کے لیے سکون، تربیت اور اپنائیت کا ایک مستقل سرچشمہ بن گئیں۔

درحقیقت محترمہ والدہ ماجدہ اُن خواتین میں سے تھیں جن کے متعلق یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ گھر کو صرف آباد نہیں کرتیں بلکہ اُس میں روح پھونک دیتی ہیں۔ اُن کی موجودگی سے گھر محض رہائش گاہ نہیں رہتا بلکہ محبت، دعا، سکون اور تہذیب کا ایک نورانی آشیانہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت والدِ گرامی کی زندگی کے ہر روشن باب میں محترمہ والدہ کی محبت، رفاقت، قربانی اور خاموش عظمت ایک مضبوط بنیاد کی حیثیت سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

اولاد کی سعادت اور ذمہ داریاں

اللہ تعالیٰ کے فضلِ عظیم، رحمتِ کاملہ اور دعاؤں کی قبولیت سے حضرت والدِ گرامی کی ازدواجی زندگی رفتہ رفتہ محبت، سکون اور خاندانی برکتوں کے ایسے حسین مرحلے میں داخل ہونے لگی جہاں اُن کے آشیانہ حیات میں نئی نسل کی معصوم خوشبوئیں مہکنے لگیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۷۹ء میں قدرتِ الٰہی نے حضرت والدِ محترم کو ایک صاحبزادی کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، جن کا اسمِ گرامی امتہ الرحمٰن شمیسہ صدیقہ رکھا گیا (جو میری ہمشیرہِ اکبر ہیں)۔ اُن کی ولادت نے گویا گھر کی فضاؤں میں رحمت، نرمی اور قلبی مسرت کی ایک نئی بہار پیدا کر دی۔

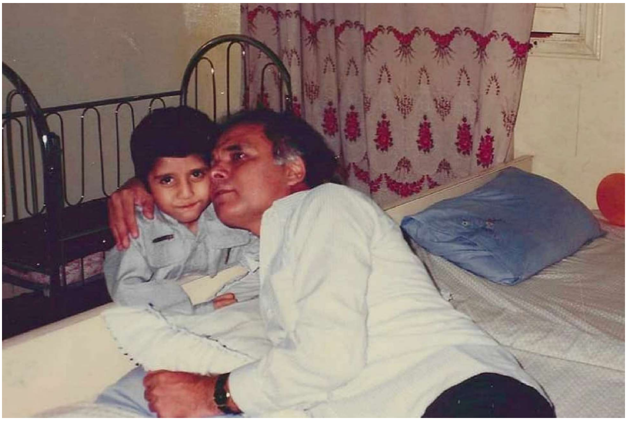
اس ننھی شہزادی کی آمد سے حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ ماجدہ کی زندگی میں خوشیوں کی ایسی دلآویز کیفیت پیدا ہوئی کہ گھر کا ہر گوشہ محبت، دعا اور معصوم تبسم کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ حضرت والدِ محترم اپنی صاحبزادی سے بے حد شفقت فرمایا کرتے تھے، اور اُن کی معصوم حرکات، ننھی مسکراہٹیں اور بچکانہ معصومیت اُن کے لیے دنیا کی تمام تر مشقتوں کے بعد سکونِ قلب کا ذریعہ بن جاتی تھیں۔

پھر اگلے ہی برس، یعنی سنہ ۱۹۸۰ء میں، اللہ تعالیٰ نے حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ کی زندگی میں ایک اور خوشی عطا فرمائی، اور اس خاکسار کو اُن کے گھرانے کا حصہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ الحمدللہ۔ یہ وہ مبارک دور تھا جب حضرت والدِ محترم کی زندگی بیک وقت خاندانی مسرت، عملی استحکام اور روحانی اطمینان کے حسین امتزاج سے مزین ہو رہی تھی۔





بعدازاں سنہ ۱۹۸۴ء میں ہمارے چھوٹے بھائی، ابوالخیر احمد عزیر صدیقی کی ولادت نے اس خانوادے کی محبتوں، وابستگیوں اور قلبی تکمیل کو مزید کامل بنا دیا۔ یوں حضرت والدِ گرامی کا گھرانہ ایک مکمل، پُرسکون اور محبتوں سے لبریز خاندان کی صورت اختیار کر گیا، جہاں ہر رشتہ شفقت، دعا، تربیت اور باہمی احترام کے ریشمی بندھنوں میں بندھا ہوا تھا۔



جدہ میں ہمارا قیام نہایت سکون، محبت اور خاندانی نظم وضبط کے ساتھ گزرا۔ حضرت والدِ گرامی نہ صرف ایک ذمہ دار کفیل اور باوقار شخصیت تھے بلکہ ایک نہایت مشفق، فکرمند اور اصول پسند والد بھی تھے۔ وہ ہماری تعلیم، تربیت، صحت، اخلاق اور روزمرہ ضروریات کے متعلق غیر معمولی حساسیت اور توجہ رکھتے تھے۔ ہمارے تعلیمی معاملات ہوں، صحت کی دیکھ بھال ہو، یا زندگی کے عملی آداب — حضرت والدِ محترم ہر مرحلے میں خاموش ذمہ داری، محبت بھرے نظم، اور پدرانہ شفقت کے ساتھ ہماری رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔

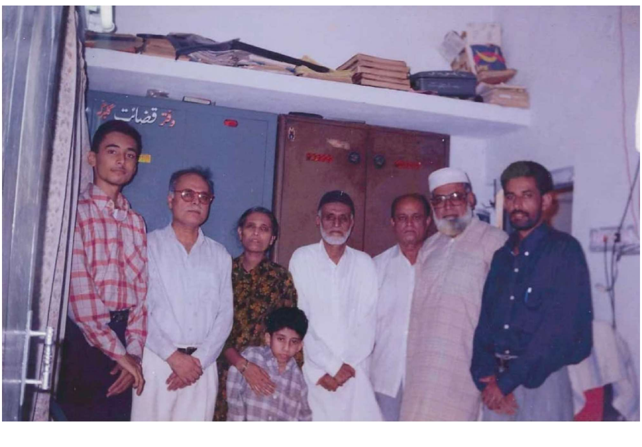
خدمتِ خلق

حضرت والدِ گرامی کی عظمت صرف اپنی محدود خاندانی ذمہ داریوں تک مقید نہ تھی۔ جیسے کہ وہ سعودی عربئین ایرلائینس سے وابستہ تھے، اس لیے اُنہیں یہ سعادت اور سہولت حاصل تھی کہ وہ اپنے قریبی اہلِ خاندان کے لیے سفر کے انتظامات اور ٹکٹوں کی معاونت فراہم کر سکتے تھے۔ حضرت والدِ محترم نے اس سہولت کو محض ذاتی آسائش یا محدود فائدے کے لیے استعمال نہ کیا بلکہ اسے ایک عظیم خدمتِ خلق، صلہ رحمی اور روحانی تعاون کا ذریعہ بنا دیا۔

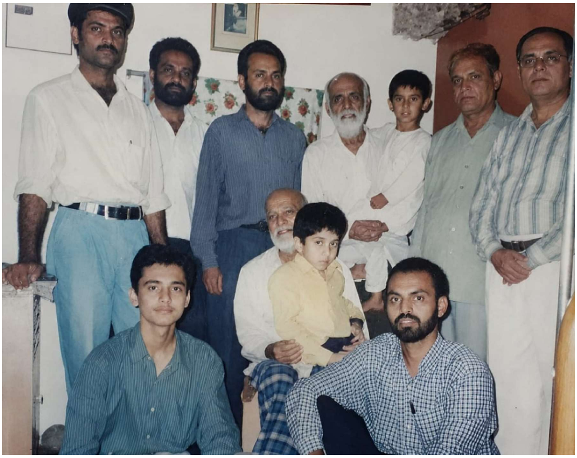
وہ اپنے والدین، سسرال کے بزرگوں، بہن بھائیوں اور دیگر عزیز و اقارب کو بارہا سرزمینِ حجاز کی حاضری، حج و عمرہ کی سعادت، اور مقدس مقامات کی زیارت کے مواقع فراہم کرنے کی بھرپور کوشش فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی دلی خواہش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ قریبی افراد اللہ تعالیٰ کے گھر کی حاضری نصیب کریں اور روحانی برکتوں سے مستفید ہوں۔ اُس زمانے میں حج و عمرہ کا سفر نہایت محنت، طویل منصوبہ بندی اور مالی استطاعت کا متقاضی سمجھا جاتا تھا، لیکن حضرت والدِ گرامی نے اپنی استطاعت، اپنی حیثیت، اور اپنے وسائل کو دوسروں کے لیے آسانی اور سہولت کا وسیلہ بنا دیا۔

یوں وہ محض اپنے گھر کے کفیل نہ رہے بلکہ اہلِ خاندان کے لیے خیر، برکت، روحانی سعادت اور دینی سہولتوں کا ایک زندہ ذریعہ بن گئے۔ اُن کی اس خدمت نے اُنہیں خاندان میں بے حد عزت، دعاؤں اور محبت کا مستحق بنا دیا۔

درحقیقت یہ سب حضرت والدِ گرامی کی محنت، اُن کی نیک نیتی، اُن کے برادرانِ اکابر کی دعاؤں، قربانیوں اور تربیت کا ثمر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں نہ صرف عملی میدان میں کامیابی عطا فرمائی بلکہ ایک پُرسکون خانوادگی زندگی، صالح اولاد، اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی توفیق سے بھی سرفراز فرمایا۔ یہی ایک حقیقی کامیاب انسان کی علامت ہے کہ اُس کی ذات صرف اپنی ترقی تک محدود نہ رہے بلکہ اُس کے ذریعے دوسروں کی زندگیاں بھی خیر، محبت اور برکت سے منور ہوتی رہیں۔



جدہ میں قیام کے دوران حضرت والدِ گرامی نے نہ صرف اپنی ازدواجی اور اولادی زندگی کو محبت، نظم و ضبط اور وقار کے ساتھ سنوارا بلکہ اپنے برادرانِ اکابر اور اُن کے اہلِ خانہ کے ساتھ تعلقِ وفا، صلہ رحمی اور عملی تعاون کا وہ روشن باب بھی قائم رکھا جو اُن کی شخصیت کے بلند اخلاق اور خاندانی عظمت کا نہایت نمایاں پہلو تھا۔







حضرت والدِ محترم اپنی مصروف عملی زندگی، محدود وسائل اور پردیسی ذمہ داریوں کے باوجود ہمیشہ اپنے بڑے بھائیوں کے عیال واطفال کے لیے ایک مضبوط سہارا بنے رہے۔ اُن کے بھتیجوں اور بھانجیوں کی تعلیم، ضروریات، تربیت اور دیگر معاملات میں وہ حتی المقدور خاموشی، خلوص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ دست گیری فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں یہ وصف نمایاں تھا کہ وہ اپنی کامیابیوں اور استطاعت کو صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھتے بلکہ اہلِ خاندان کے ترقی اور استحکام کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

سب سے قابلِ تحسین امر یہ تھا کہ زمانے کے بدلتے حالات، فاصلے، مصروفیات اور زندگی کی نئی ترجیحات بھی حضرت والدِ گرامی اور اُن کے برادرانِ اکابر کے درمیان محبت، اعتماد اور قلبی وابستگی کو کمزور نہ کرسکیں۔ اُن بھائیوں کے درمیان رشتہ محض نسبی تعلق نہ تھا بلکہ ایثار، قربانی، دعاؤں، اور مشترکہ جدوجہد کے ایسے لازوال جذبوں سے عبارت تھا جو وقت گزرنے کے

ساتھ مزید مستحکم ہوتے گئے۔ حضرت والدِ گرامی ہمیشہ اپنے برادرانِ اکابر کی نصیحتوں، تجربات اور دعاؤں کو اپنی زندگی کی کامیابی کا اصل سرمایہ تصور فرمایا کرتے تھے۔

صلہ رحمی اور خدمتِ خلق کے متعلق یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس، حضرت والدِ گرامی کے محترم چچا نے ایک نہایت مبارک، فلاحی اور تعلیمی مقصد کے تحت صدیقی ایجوکیشنل ویلفیئر اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کی بنیاد قائم فرمائی۔ اس ادارے کا مقصد محض رسمی تعلیم کا فروغ نہ تھا بلکہ خصوصاً اردو داں اور معاشی طور پر کمزور طبقے کی بچیوں کو تعلیم، تربیت اور شعور کی روشنی فراہم کر کے اُنہیں باوقار اور باصلاحیت زندگی کی طرف گامزن کرنا تھا۔ اسی عظیم مقصد کے تحت فاطمہ صدیقہ اردو گرلس ہائی اسکول (جو کہ حضرت والدِ گرامی کے دادی صاحبہ کے اسمِ گرامی سے منسوب تھا) کا قیام عمل میں آیا، جو رفتہ رفتہ علاقہ شیخ روضہ گلبرگہ میں دینی وتہذیبی شناخت کے ساتھ نسوانی تعلیم کے ایک اہم مرکز کے طور پر پہچانا جانے لگا۔

حضرت والدِ گرامی ابتدا ہی سے علم، خصوصاً دینی و تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ تعلیم، کو معاشرے کی حقیقی اصلاح اور ترقی کی بنیاد تصور فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک کسی بھی قوم کی بیداری اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اُس کی بیٹیاں تعلیم، شعور، اخلاق اور تہذیبی وقار سے آراستہ نہ ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا تو حضرت والدِ محترم نے نہایت احساسِ ذمہ داری کے ساتھ خود کو اس فلاحی مشن سے وابستہ کرلیا۔



اگرچہ اس ادارے کی خدمت میں خاندان کے دیگر افراد بھی شریک تھے، لیکن حضرت والدِ گرامی کا کردار نہایت مستقل، خاموش اور مخلصانہ نوعیت کا تھا۔ وہ نہ صرف اخلاقی سطح پر اس ادارے کی معاونت فرمایا کرتے تھے بلکہ باقاعدگی کے ساتھ مالی تعاون بھی پیش کرتے رہے تاکہ اسکول کے اخراجات، طالبات کی ضروریات، اور تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ بغیر رکاوٹ جاری رہ سکے۔

تقریباً دو دہائیوں تک محترم والد گرامی اس تعلیمی ادارے کے ساتھ وابستہ رہے۔ یہ وابستگی محض ایک رسمی رکنیت یا خاندانی تعاون تک محدود نہ تھی بلکہ اُس کے پس منظر میں ایک دردمند دل، ایک خیر خواہ ذہن، اور قوم کی بیٹیوں کو محرومی اور پسماندگی سے نکالنے کی تڑپ موجود تھی۔ وہ غریب اور کمزور گھرانوں کی بچیوں کی تعلیم کے لیے نہایت فکرمند رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُنہیں ایسا ماحول میسر آئے جو اُن کی شخصیت، خوداعتمادی اور مستقبل کو بہتر بنا سکے۔

حضرت والدِ گرامی کے نزدیک تعلیم صرف روزگار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ کردار سازی، تہذیبی بقا، اور معاشرتی عزت و استحکام کی بنیاد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس ادارے کو محض ایک اسکول کے طور پر نہیں بلکہ ایک اصلاحی اور رفاہی مشن کے طور پر دیکھتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بعض داخلی پیچیدگیاں، انتظامی کمزوریاں، اور افسوسناک طور پر بعض باہمی اختلافات و داخلی سیاست نے اس ادارے کے ماحول کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ حضرت والدِ محترم چونکہ فطرتاً نہایت اصول پسند، صاف گو اور نظم و دیانت کو اہمیت دینے والی شخصیت کے مالک تھے، اس لیے وہ ایسے ماحول سے قلبی طور پر مطمئن نہ رہ سکے جہاں خلوصِ نیت اور تعلیمی خدمت کے بجائے دیگر غیر ضروری عوامل غالب آنے لگیں۔



دوراندیش تدابیر اور سرمایہ کاری

چونکہ حضرت والدِ محترم اب سعودی عرب میں عملی طور پر مستحکم ہو چکے تھے، اس لیے اُن کے برادرانِ اکابر نے نہایت دور اندیشی اور خاندانی بصیرت کے ساتھ اُنہیں مستقبل کی منصوبہ بندی، بچت اور مستقل سرمایہ کاری کی طرف متوجہ کیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ حضرت والدِ گرامی صرف وقتی آسودگی تک محدود نہ رہیں بلکہ اپنے آئندہ نسل کے لیے بھی ایک مضبوط معاشی بنیاد قائم کریں۔ چنانچہ برادرانِ اکابر کے مشوروں، رہنمائی اور خیر خواہانہ فکر کے تحت حضرت والدِ محترم نے تدبر اور منصوبہ بندی کے ساتھ مختلف جائیدادوں اور زرعی املاک میں سرمایہ کاری کا آغاز کیا۔

اسی سلسلے میں انہوں نے بھاگوڑی میں زرعی اراضی، گلبرگہ میں اسلام آباد کالونی میں رہائشی قطعہ زمین، اور بارے ہلز کے علاقے میں بھی جائیداد حاصل کی۔ یہ تمام فیصلے محض مادی جمع پونجی کے لیے نہ تھے بلکہ اُن کے پیچھے ایک دوررس خاندانی وژن، اولاد کے مستقبل کا تحفظ، اور آنے والی نسل کے لیے استحکام فراہم کرنے کی گہری فکر کارفرما تھی۔



یہ حضرت والدِ گرامی کی غیر معمولی منصوبہ بندی، مالی نظم وضبط، اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ برکت کا ہی نتیجہ تھا کہ محدود تنخواہ اور سادہ طرزِ زندگی کے باوجود وہ نہایت متوازن انداز میں گھر کے اخراجات، اہلِ خاندان کی ضروریات، بچوں کی تعلیم و تربیت، رشتہ داروں کی معاونت، اور مستقبل کی سرمایہ کاری — سب کو بہترین ترتیب اور حکمت کے ساتھ نبھاتے رہے۔ اُن کی کمائی میں ایسی عجب برکت تھی کہ وسائل بظاہر محدود ہونے کے باوجود ضروریات کبھی رکاوٹ نہ بن سکیں۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہ**

حضرت والدِ گرامی نے اپنی زندگی کی سختیوں، بچپن کی محرومیوں، اور زمانے کی دشواریوں کو محض ذاتی تجربہ بنا کر فراموش نہیں کر دیا، بلکہ اُن آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے یہ عہد

کرلیا کہ اُن کی آئندہ نسلیں اُن تلخیوں اور عدمِ تحفظ کا سامنا نہ کریں جن سے وہ خود گزرے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا مضبوط معاشی، اخلاقی اور خاندانی استحکام فراہم کرنے کی بنیاد رکھی جس پر سکون، عزت اور باوقار زندگی کی ایک مستحکم عمارت تعمیر ہو سکے۔

درحقیقت حضرت والدِ محترم کی یہ دور اندیشی، مالی حکمت اور قربانی کا جذبہ اُن کی شخصیت کے اُن اوصاف میں سے ہے جنہوں نے نہ صرف اُنہیں ایک کامیاب فرد بنایا بلکہ ایک ایسا باوقار معمارِ خاندان بھی ثابت کیا جس نے اپنی محنت، اپنی دعاؤں اور اپنی مسلسل جدوجہد کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے آسانی، تحفظ اور استحکام کے دروازے کھول دیے۔

پردیس کے باوفا ساتھی

حضرت والدِ گرامی کی طویل ملازمت کے ایام، صرف پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور دفتری مصروفیات تک محدود نہ تھے بلکہ اُن سالوں میں اُنہیں ایسے مخلص رفقاء، خیرخواہ احباب، اور باوفا ساتھیوں کی رفاقت بھی نصیب ہوئی جنہوں نے پردیس کی زندگی کو آسان، خوشگوار اور قلبی وابستگیوں سے معمور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

پردیس کی زندگی بظاہر معاشی استحکام ضرور عطا کرتی ہے، لیکن اُس کے پسِ پردہ تنہائی، جدوجہد، ثقافتی فرق، اور روزمرہ کی بے شمار عملی دشواریاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں بعض شخصیات انسان کے لیے محض ساتھی نہیں بلکہ سہارا، اعتماد اور قلبی سکون کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ حضرت والدِ محترم کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی مخلص اور وفادار دوستوں سے نوازا، جنہوں نے اُن کے عملی سفر میں ہر ممکن تعاون، خلوص اور محبت کا مظاہرہ فرمایا۔

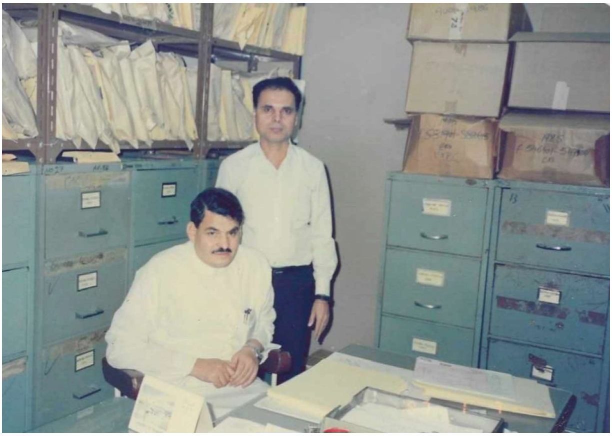
اُن ممتاز شخصیات میں مرچنٹ صاحب کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، جو حضرت والدِ گرامی کے نہایت مخلص معاون اور خیرخواہ احباب میں شمار ہوتے تھے۔ وہ خصوصاً مالی

معاملات، بالخصوص ریال سے ہندوستانی کرنسی میں ترسیلات اور تبادلہ زر کے امور میں حضرت والدِ محترم کی ہر ممکن معاونت فرمایا کرتے تھے۔ پردیس میں ایسے معاملات اُس زمانے میں نہایت اہم اور بعض اوقات پیچیدہ نوعیت کے ہوتے تھے، لیکن مرچنٹ صاحب کی دیانت داری، تعاون اور اخلاص نے حضرت والدِ گرامی کے لیے یہ امور ہمیشہ سہل بنائے رکھا۔

اسی طرح سعودی عرب کے مقامی احباب میں غازی عنبر صاحب اور حمزہ صاحب جیسے مخلص دوست بھی حضرت والدِ محترم کی رفاقت کا اہم حصہ رہے۔ یہ تعلقات محض رسمی دفتری روابط نہ تھے بلکہ باہمی احترام، اپنائیت اور انسانی خلوص پر مبنی دیرپا دوستیوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے باوجود اُن تعلقات میں جو محبت اور اخلاص پایا جاتا تھا، وہ حضرت والدِ گرامی کی خوش اخلاقی اور وسیع القلبی کی روشن دلیل تھا۔

شفیع انکل بھی حضرت والدِ محترم کے اُن قابلِ ذکر رفقاء میں شامل تھے جنہوں نے روزمرہ زندگی میں نہایت عملی تعاون فراہم فرمایا۔ وہ نہ صرف دفتری ساتھی تھے بلکہ حضرت والدِ محترم کی آمد و رفت اور روزانہ دفتر پہنچنے کے سلسلے میں بھی مستقل معاونت فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی یہ محبت بھری سہولت رسانی پردیس کی مصروف زندگی میں ایک بڑی نعمت محسوس ہوتی تھی۔

اسی طرح حمید انکل کا تعلق حضرت والدِ گرامی سے محض دفتر تک محدود نہ تھا بلکہ پڑوسی ہونے کے باعث قربت اور گھریلو جیسے تعلقات میں بھی شامل تھے۔ اُن کے درمیان ایک نہایت مخلصانہ تعلق قائم ہوگیا تھا، جس میں پڑوسیوں والی اپنائیت، ایک دوسرے کے حالات کا خیال، اور پردیس میں باہمی تعاون کا جذبہ نمایاں تھا۔



عارف انکل حضرت والدِ محترم کے نہایت قریبی اور قلبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ دفتری ماحول میں اُن کی رفاقت حضرت والدِ گرامی کے لیے نہ صرف اعتماد اور سہارا تھی بلکہ ایک ذہنی وجذباتی سکون کا ذریعہ بھی تھی۔ ایسے دوست انسان کی عملی زندگی کو صرف آسان نہیں بناتے بلکہ اُس میں ایک خوشگوار توازن اور اطمینان بھی پیدا کرتے ہیں۔

دفتر کے دائرے سے باہر بھی حضرت والدِ گرامی کے بعض نہایت قریبی احباب تھے جن میں سخاوت انکل اور فرید انکل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں شخصیات ہمارے گھر کے ماحول کا گویا مستقل حصہ بن چکے تھے۔ اُن کی آمد و رفت، محبت بھری نشستیں اور خوشگوار محفلیں پردیس کی زندگی میں اپنائیت، خوشی کا باعث بنتی تھیں۔ وہ اکثر ہمارے گھر تشریف لاتے اور حضرت والدِ محترم کے ساتھ نہایت خلوص، محبت اور بے تکلفی کے ساتھ وقت گزارتے۔



درحقیقت حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کا یہی حسن تھا کہ وہ جہاں بھی رہے، اپنے اخلاق، نرم خوئی، خلوص، دیانت اور وسیع القلبی کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتے چلے گئے۔ اُن کے گرد موجود یہ احباب، ساتھی اور خیر خواہ شخصیات اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ ایک اچھا انسان اپنی زندگی میں صرف رشتے نہیں بناتا بلکہ محبت، احترام اور وفاداری کے ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے جو زمانے گزرنے کے باوجود دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔







سفری تجربات کے دلنشین ابواب

حضرت والدِ گرامی کی زندگی صرف محنت، ذمہ داریوں، مالی منصوبہ بندی اور خاندانی استحکام تک محدود نہ تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی عملی وابستگیوں کے سبب دنیا کو قریب سے دیکھنے، مختلف تہذیبوں کا مشاہدہ کرنے، اور اہلِ خانہ کے ساتھ خوشگوار یادیں سمیٹنے کے نہایت حسین مواقع بھی عطا فرمائے۔ جیسے کہ حضرت والدِ محترم سعودی عربئین ایرلائینس سے وابستہ تھے، اُنہیں اور اُن کے اہلِ خانہ کو فضائی سفر کی خصوصی سہولتیں میسر تھیں، جس نے اُن کی زندگی میں وسعتِ مشاہدہ، ثقافتی آگاہی اور خوشگوار سفری تجربات کے کئی دلنشین ابواب رقم کی۔

حضرت والدِ گرامی فطرتاً نہایت متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جہاں ایک طرف معاشی نظم، بچت اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں غیر معمولی سنجیدگی رکھتے تھے، وہیں دوسری جانب زندگی کے خوبصورت پہلوؤں، اہلِ خانہ کے ساتھ خوشگوار لمحات، اور دنیا کے مختلف رنگوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے ذوق سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اُنہیں مختلف بین الاقوامی اسفار کے مواقع بھی حاصل ہوتے رہے۔

اپنے بعض قریبی احباب کے ہمراہ انہوں نے لندن، پیرس، فرنک فورٹ جیسے عالمی شہرت یافتہ شہروں کا سفر کیا۔ یہ اسفار محض تفریح یا سیاحت کے لیے نہ تھے بلکہ اُن کے ذریعے حضرت والدِ محترم کو مختلف تہذیبوں، معاشرتی نظم، طرزِ زندگی، تاریخی عظمتوں اور جدید دنیا کے وسیع تناظر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی طبیعت میں موجود مشاہداتی گہرائی اور فکری وسعت نے ان تجربات کو محض سفر کی حد تک محدود نہ رہنے دیا بلکہ ہر شہر، ہر تہذیب اور ہر منظر اُن کے شعور میں ایک نئی فکر اور نئے احساسات کی صورت محفوظ ہوتا چلا گیا۔

اسی طرح حضرت والدِ گرامی نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بھی نہایت محبت اور اہتمام کے ساتھ مختلف اسفار کیے۔ خصوصاً سنہ ۱۹۹۳ء میں استنبول کا سفر ہمارے لیے نہایت یادگار اور مسرت آفریں ثابت ہوا۔ اُس تاریخی شہر کی روح پرور فضا، عثمانی تہذیب کی جھلکیاں، مساجد کی روحانیت، سمندری مناظر، اور اہلِ خانہ کے ساتھ گزارے گئے خوشگوار لمحات نے ہماری زندگی میں ایسی یادیں چھوڑیں جو آج بھی قلب و ذہن میں تازگی کے ساتھ محفوظ ہیں۔ حضرت والدِ گرامی ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اہلِ خانہ کو محض مادی سہولتیں ہی نہ میسر آئیں بلکہ انہیں زندگی کی خوبصورتی، دنیا کی وسعت اور خاندانی خوشیوں کا حقیقی لطف بھی حاصل ہو۔

بعدازاں مجھے بھی کم عمری میں سنہ ۱۹۹۴ء میں حضرت والدِ محترم کے ہمراہ سنگاپور جانے کا موقع ملا۔ وہ سفر آج بھی میرے حافظے میں محبت اور بچپن کی خوشگوار معصوم یادوں کے ساتھ نقش ہے۔ حضرت والدِ گرامی کی شفقت، اُن کا خیال رکھنا، اور سفر کے دوران اُن کی پدرانہ محبت کا انداز اس قدر دلنشین تھا کہ وہ لمحات میری زندگی کے قیمتی ترین اثاثوں میں شمار ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی اسفار کے ساتھ ساتھ حضرت والدِ محترم سعودی عرب کے مختلف شہروں کا بھی سفر فرمایا کرتے تھے، خصوصاً اُن عزیز و اقارب سے ملاقات کے لیے جو ریاض، ینبع، جبیل، طائف میں مقیم تھے۔ اُن کی طبیعت میں صلہ رحمی، خاندانی تعلقات کی پاسداری، اور عزیزوں سے وابستگی کا جذبہ اس قدر مضبوط تھا کہ مصروفیات کے باوجود وہ رشتہ داروں سے تعلقات کو ہمیشہ زندہ رکھتے۔

تاہم ان تمام اسفار میں سب سے زیادہ روحانی، بابرکت اور قلبی سکون بخش سفر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے تھے۔ ہمارے لیے حرمین شریفین کی حاضری کوئی نایاب یا وقتی سعادت نہ تھی بلکہ حضرت والدِ گرامی کی محبتِ دینی اور روحانی وابستگی کے باعث یہ مبارک سفر ہماری زندگی کا مستقل حصہ بن چکے تھے۔ بارہا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری، عمرے کی سعادت، اور روضہ رسول ﷺ کے سامنے حاضر ہونے کے وہ روح پرور لمحات ہماری تربیت، ہمارے ایمان، اور ہماری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ بن گئے۔

یوں حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں دنیاوی ذمہ داریوں، معاشی حکمت، خاندانی محبت، روحانی وابستگی، اور تہذیبی وسعت کا ایسا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے جو اُن کی شخصیت کو نہ صرف ایک کامیاب انسان بلکہ ایک باوقار، متوازن اور ہمہ جہت شخصیت کے طور پر نمایاں کرتا ہے۔



سنہ ۱۹۹۶ میں احسن چچا کے ساتھ حج کی ادائیگی کی ایک یادگار تصویر

بیتِ عزیز

وقت کا قافلہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور زندگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے حضرت والدِ گرامی رفتہ رفتہ اُس عمر اور مقام تک پہنچنے لگے جہاں انسان مستقبل کے اگلے باب یعنی سبکدوشی، مستقل قیام اور آنے والی نسلوں کے استحکام کے متعلق نہایت سنجیدگی اور دور اندیشی کے ساتھ غور کرنا شروع کرتا ہے۔ حضرت والدِ محترم چونکہ فطرتاً نہایت مدبر، منصوبہ ساز اور مستقبل بین شخصیت کے مالک تھے، اس لیے انہوں نے بہت پہلے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ ملازمت کے ایام ہمیشہ باقی نہیں رہتے، اور ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب انہیں عملی زندگی سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر وطنِ عزیز میں سکونت اختیار کرنا ہوگی۔

اگرچہ اُس وقت تک حضرت والدِ گرامی ہر سال تعطیلات کے دوران گلبرگہ تشریف لاتے رہے تھے اور خاندانی وابستگیوں کے باعث علیحدہ مستقل رہائش کی فوری ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، لیکن اب حالات بدل رہے تھے۔ ہم، یعنی اُن کی اولاد، بھی عمر اور تعلیم کے نئے مراحل میں داخل ہو رہے تھے، اور حضرت والدِ محترم بخوبی سمجھتے تھے کہ آئندہ زندگی کے لیے ایک مستقل، باوقار اور منظّم آشیانے کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکا ہے۔

چنانچہ سنہ ۲۰۰۰ء میں حضرت والدِ گرامی نے اپنی دیرینہ بصیرت، خاندانی وقار اور اپنی نسل کے استحکام کے تصور کے تحت اپنے ذاتی گھر کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز فرمایا۔ گلبرگہ میں بارے ہلز کی پُرسکون اور باوقار فضاؤں میں اُس گھر کی بنیاد رکھی گئی جسے نہایت محبت کے جذبے کے ساتھ اپنے چھوٹے فرزند کے شان میں، بیتِ عزیر کا نام دیا جانا طے پایا۔ یہ گھر محض اینٹ، پتھر اور تعمیراتی ڈھانچے کا مجموعہ نہ تھا بلکہ حضرت والدِ گرامی کی پوری زندگی کی جدوجہد، قربانیوں، خوابوں، منصوبہ بندی اور خاندانی استحکام کے تصور کا عملی اظہار تھا۔



غوث پاشاہ ماموں جان، ایجاز انکل، فقیر پاشاہ ماموں جان، محترم دادا حضرت، مبشر بھائی، محترم اور والد صاحب



ایجاز انکل، ستار صاحب (انجنئر)، محترم دادا حضرت، فقیر پاشاہ ماموں جان، مبشر بھائی، محترم والد صاحب، سعود بھائی صاحب، مشہود بھائی صاحب، عزیر، عفان



معظم تایا ابا، غوث پاشاہ ماموں جان، ایجاز انکل، محترم دادا حضرت، محترم والد صاحب، سعود بھائی، اور مشہود بھائی

اسی دوران میری تعلیمی زندگی بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میرا ہائی اسکول جدہ میں مکمل ہوا، اور بعد ازاں سنہ ۱۹۹۷ء میں حضرت والدِ گرامی نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان منتقل کر دیا تا کہ میں پی۔ یو۔ سی (PUC) کالج کی تعلیم حاصل کر سکوں۔ حضرت والدِ محترم ہمیشہ ہماری تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم صرف ڈگریاں حاصل نہ کریں بلکہ علمی وقار، عملی قابلیت اور مضبوط کردار کے حامل بنیں۔

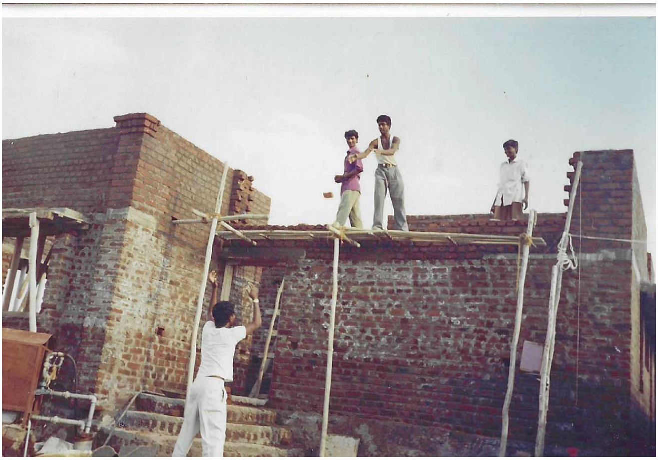
اللہ تعالیٰ کے فضل سے سنہ ۲۰۰۰ء تک میں نے اپنی پی۔ یو۔ سی کی تعلیم مکمل کر لی اور بعد ازاں میکانیکل انجینئر نگ میں داخلہ حاصل کر لیا۔ انہی ایام میں چونکہ حضرت والدِ گرامی سعودی عرب میں اپنی ملازمت کی آخری ذمہ داریوں میں مصروف تھے، اس لیے انہوں نے مجھ پر خصوصی اعتماد کرتے ہوئے بیتِ عزیز کی تعمیراتی نگرانی کی اہم ذمہ داری تفویض فرمائی۔ اس ذمہ داری میں میرے تایازاد بھائی، مشہود بھائی اور مبشر بھائی بھی بھرپور تعاون اور خلوص کے ساتھ شریک رہے۔



مبشر بھائی صاحب اور کوثر صاحب (انجنیئر)



مشہود بھائی صاحب اور کوثر صاحب (انجنیئر)







بیتِ عزیز کی جدید توسیع

ملازمت سے سبکدوشی

بالآخر سنہ ۲۰۰۱ء میں حضرت والدِ گرامی نے سعودی اربئین ایرلائنس میں مسلسل ۲۳ برس تک نہایت دیانت داری، وقار، محنت اور ذمہ داری کے ساتھ خدمات انجام دینے کے بعد اپنی ملازمت سے باعزت طور پر سبکدوشی اختیار کی۔ یہ محض ریٹائرمنٹ نہ تھی بلکہ ایک طویل، کامیاب اور باوقار عملی سفر کی تکمیل تھی، جس میں انہوں نے اپنے کردار، اصول پسندی اور مستقل مزاجی سے عزت، استحکام اور کامیابی حاصل کی۔

قدرت کا حسین انتظام دیکھیے کہ اُسی زمانے میں بیتِ عزیز کی تعمیر بھی مکمل ہوگئی۔ گویا حضرت والدِ گرامی نے اپنی پوری زندگی کو اس قدر حکمت اور تدبر کے ساتھ ترتیب دیا تھا کہ عملی زندگی سے فراغت کے فوراً بعد اُن کے لیے ایک مکمل، پُرسکون اور باوقار آشیانہ تیار موجود تھا۔

چنانچہ جب حضرت والدِ محترم مستقل طور پر ہندوستان واپس تشریف لائے تو وہ اپنے اسی نئے گھر میں منتقل ہوگئے۔ بیتِ عزیز صرف ایک مکان نہ تھا بلکہ اُن کی محنت، اُن کی قربانیوں، اُن کے خوابوں اور اان کی نسلوں کے لیے اُن کے تحفظ و سکون کے تصور کی ایک جیتی جاگتی تعبیر تھا۔


saudia السعودية
SERVICE APPRECIATION CERTIFICATE
شهــادة تعـــديــــر خدمــــة
SAUDIA have pleasure in awarding this
certificate to QAZI MOHAMMAD H. SIDDIQUI
in recognition of his services to the corporation
from 24/09/1398 to 23/09/1403
يســر السعـودية أن تمنـح هــذه الشهـــادة
للموظـف قاضي محمد حفيظ صديقي
من ١٣/٠٩/١٣٩٨ إلى ١٤٠٠٣/١٣٩٨
Director General
المـديـر العـــام
1 / 10 / 1983
Date
التاريخ
5 Years Service
٥ سنوات خدمة


saudia السعودية
SAUDI ARABIAN AIRLINES
SERVICE APPRECIATION CERTIFICATE
saudia have pleasure in awarding this
certificate to KAZI MOHAMMAD H. H. SIDDIQUI
in recognition of his services to the corporation
from 23-09-1398
to 23-09-1408
للموظـف فاضي محمد حفيظ ضديقي
من ١٣٩٨/٠٩/٢٣
إلى ١٤٠٨/٠٩/٢٣هـ
Director General
Date 9-2-1410
التاريخ ١٤١٠/٢/٩هـ
10
10


saudia السعودية
SAUDI ARABIAN AIRLINES
الخطوط الجوية العربية السعودية
شهادة خدمة تقديرية
Service Appreciation Certificate
Saudi Arabian Airlines has the
pleasure of awarding this certificate
to employee Qadi Mohd H. Siddiqui
in recognition of his services
from 24/09/1398 to 23/09/1413
يسر الخطوط الجوية العربية السعودية
أن تقــدم هــذه الشهـــادة الى
الموظف قاضي محمد حفيظ صديقي
تقديرا لخدماته لديها خلال الفترة
من ١٣٩٨/٠٩/٢٤ الى ١٤١٣/٠٩/٢٣
15 YEARS
DR. KHALED A. BEN BAKR
Director General
Date 01/06/1994
د. خالد عبدالله بن بكر
المدير العام
التاريخ ١٤١٤/١٢/٢٢
١٥ سنة

درحقیقت حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کا یہی امتیاز تھا کہ انہوں نے زندگی کو محض وقتی جذبات یا حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا، بلکہ ہر مرحلے کو تدبر، حکمت، صبر اور دور اندیشی کے ساتھ اس انداز میں ترتیب دیا کہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے بھی آسانی، استحکام اور وقار کی مضبوط بنیاد قائم کر سکیں۔

حضرت والدِ گرامی جب سرزمینِ حجاز سے اپنی طویل، باوقار اور کامیاب عملی خدمات مکمل کر کے مستقل طور پر وطنِ عزیز واپس تشریف لائے اور بیتِ عزیر میں سکونت اختیار کی، تو اُن کی زندگی ایک نئے باب میں داخل ہوئی۔ اب اُن کی توجہ زیادہ تر زرعی سرگرمیوں، روحانی سکون، اور پُرسکون گھریلو زندگی کی طرف مرکوز ہونے لگی۔ خصوصاً بھاگوڑی میں موجود زرعی اراضی کی دیکھ بھال اور انتظامات میں حضرت والدِ محترم خصوصی دلچسپی لینے لگے۔

اس مرحلے میں اُن کے بھتیجے، محترم مشہود بھائی، جو حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے برادرِ محترم کے دوسرے صاحبزادے تھے، نہایت خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ اُن کے دست و بازو بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے زرعی معاملات، روزمرہ ضروریات اور مختلف انتظامی امور میں حضرت والدِ محترم کا بھرپور تعاون فرمایا۔ اُن کی شخصیت میں اپنے چچا جان کے لیے بے پناہ احترام، قلبی وابستگی اور خدمت کا ایسا جذبہ نمایاں تھا جو رفتہ رفتہ حضرت والدِ گرامی کے لیے ایک مضبوط سہارا بنتا چلا گیا۔



محترم مشہود بھائی اُن شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں خاندانی وفاداری، سماجی شعور، محبت، خدمت اور ذمہ داری کا جذبہ فطری طور پر رچا بسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ محض ایک قریبی عزیز یا خاندان کے فرد کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں ایک ایسے مخلص، فعال اور قابلِ اعتماد سہارے کے طور پر نمایاں رہے ہیں جنہوں نے ہر مرحلے پر محبت، اخلاص اور عملی معاونت کے ذریعے اپنی وابستگی کا ثبوت پیش کیا۔

اُن کی شخصیت میں ایک غیر معمولی وسعتِ قلب، ملنساری اور سماجی اپنائیت پائی جاتی ہے۔ وہ نہایت کشادہ ذہن اور باہمی تعلقات کو نبھانے کے فن سے بخوبی آشنا انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقات، مختلف مزاجوں اور مختلف حلقوں کے افراد کے ساتھ نہایت آسانی اور خلوص کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں شائستگی، انداز میں اعتماد، اور رویّے میں ایسا جذبۂ خیر خواہی موجود ہے جو لوگوں کو اُن کے قریب لے آتا ہے۔

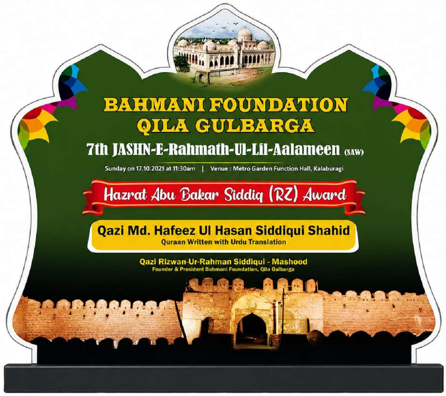
محترم مشہود بھائی کی شخصیت صرف خاندانی حدود تک محدود نہیں بلکہ اُن میں ایک فعال سماجی کارکن، بیدار فکر نوجوان، اور قوم و ملت کے مسائل سے وابستہ دردمند انسان کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ معاشرتی، تعلیمی اور عوامی میدانوں میں نہایت سرگرم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ عوامی خدمت اور اجتماعی شعور کے جذبے نے انہیں عملی سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھنے پر آمادہ کیا، اور انہوں نے اسمبلی انتخابات میں آزاد امیدوار کے طور پر اپنا نامزدگی فارم داخل کر کے عوامی نمائندگی کے جذبے کا اظہار کیا۔

اگرچہ سیاست اُن کے لیے محض اقتدار یا ذاتی مفاد کا ذریعہ نہ تھی بلکہ وہ اسے معاشرتی خدمت، تعلیمی بیداری اور اقلیتی طبقات کی فلاح کے ایک پلیٹ فارم کے طور پر دیکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت میں قوم کے نوجوانوں، خصوصاً طلبہ کے مستقبل کے متعلق ایک حقیقی درد اور فکر ہمیشہ نمایاں رہی۔

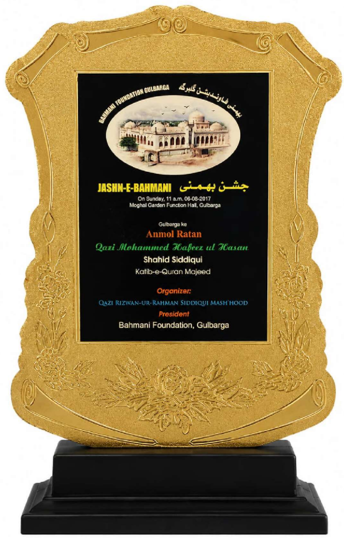
اسی جذبۂ خیر اور فکری بیداری کے تحت محترم مشہود بھائی نے بہمنی فاؤنڈیشن کے نام سے ایک رفاہی و تعلیمی پلیٹ فارم قائم فرمایا، جس کا بنیادی مقصد اقلیتی طبقے کے طلبہ و طالبات کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دینا، اُن کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا، اور اُنہیں علمی و ادبی اظہار کے مواقع فراہم کرنا تھا۔

یہ فاؤنڈیشن نہ صرف تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ طلبہ میں ادبی ذوق، تقریری صلاحیت، تخلیقی اظہار، اور علمی اعتماد پیدا کرنے کے لیے ضلعی سطح پر مختلف تقاریب، مسابقات اور پروگراموں کا بھی انعقاد کرتی رہی ہے۔ محترم مشہود بھائی اپنی ذاتی دلچسپی، مالی تعاون اور بھرپور محنت کے ساتھ ان پروگراموں کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

اُن کی ایک نہایت خوبصورت اور قابلِ تحسین عادت یہ بھی رہی کہ وہ حضرت والدِ گرامی کو ہمیشہ عزت، وقار اور خاندانی بزرگی کے ساتھ ان تقریبات میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو فرمایا کرتے تھے۔ یہ صرف رسمی احترام نہ تھا بلکہ اُن کے دل میں حضرت والدِ محترم کے لیے موجود عقیدت، محبت اور اعترافِ احسان کا ایک عملی اظہار تھا۔







محترم مشہود بھائی ہمیشہ اُن شخصیات کی حوصلہ افزائی اور قدر افزائی کے قائل رہے ہیں جنہوں نے معاشرے، تعلیم، ادب یا سماجی خدمت کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ اسی لیے وہ

وقتاً فو قتاً ضلع کی ممتاز شخصیات، اہلِ علم اور سماجی خدمت گزار افراد کو اعزازات اور القابات سے نوازتے رہے ہیں تاکہ نئی نسل میں قدر شناسی اور خدمت کے جذبے کو فروغ دیا جا سکے۔

حضرت والدِ گرامی بھی اُن شخصیات میں شامل رہے جنہیں محترم مشہود بھائی نے مختلف مواقع پر اعزازات اور خطابات سے نوازا۔ یہ دراصل ایک بھتیجے کی جانب سے اپنے محسن اور خاندان کے بزرگ کے لیے محبت، فخر اور عقیدت کا ایک خوبصورت خراج تھا۔

محترم مشہود بھائی کی سماجی، تعلیمی اور رفاہی سرگرمیاں صرف بہمنی فاؤنڈیشن تک محدود نہیں رہیں بلکہ اُنہیں خاندانی دینی ورثے، تاریخی امانتوں، اور مذہبی اداروں کی خدمت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ وہ جامعہ مسجد قلہ حشام گلبرگہ کے نائب متولی کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں، اور ساتھ ہی خاندان کے آبائی قبرستان کے نائب متولی کے طور پر بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان دونوں اہم اور باوقار ذمہ داریوں میں وہ محترم فیصل بھائی صاحب کے شانہ بشانہ نہایت خلوص، وقار اور احساسِ امانت کے ساتھ شریکِ عمل ہیں۔

یہ مناصب محض انتظامی عہدے نہیں بلکہ دینی، تاریخی اور خاندانی ورثے کی حفاظت و نگرانی کی نہایت حساس اور قابلِ احترام ذمہ داریاں ہیں۔ خصوصاً جامعہ مسجد قلہ حشام گلبرگہ جیسی عظیم

الشان اور تاریخی مسجد، جو صدیوں سے روحانیت، عبادت، علم اور خاندانی وقار کی علامت سمجھی جاتی ہے، اُس کی خدمت سے وابستہ ہونا بذاتِ خود ایک عظیم سعادت اور اعزاز ہے۔

اسی طرح خاندان کے آبائی قبرستان کی نگرانی اور خدمت بھی ایک نہایت حساس اور روحانی نوعیت کی ذمہ داری ہے، کیونکہ وہ مقام صرف تدفین کی جگہ نہیں بلکہ خاندان کی کئی نسلوں کی یادوں، دعاؤں اور تاریخی وابستگیوں کا امین ہوتا ہے۔ محترم مشہود بھائی اور محترم فیصل بھائی اس ذمہ داری کو نہایت ادب، احترام اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں تاکہ بزرگوں کے اس تاریخی ورثے کی حرمت، صفائی، نظم و نسق اور وقار ہمیشہ برقرار رہے۔

محترم فیصل بھائی صاحب اور محترم مشہود بھائی کی یہ مشترکہ خدمات دراصل خاندان کی اُن قدیم روایات کا تسلسل ہیں جن میں دینی اداروں، مساجد، قبرستانوں، اور عوامی امانتوں کی خدمت کو محض ایک منصب نہیں بلکہ سعادت تصور کیا جاتا رہا ہے۔ محترم مشہود بھائی نئی نسل کے اُن افراد میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے سماجی خدمت، تعلیمی بیداری، اور ملت کے نوجوانوں کی فکری تعمیر کو اپنی شخصیت کا مستقل حصہ بنالیا ہے۔ اُن کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ جب انسان کے دل میں اخلاص، خدمت اور قوم کے لیے خیر خواہی موجود ہو تو اُس کی ذات محض ایک فرد نہیں رہتی بلکہ ایک مثبت تحریک اور امید کا استعارہ بن جاتی ہے۔





قلعہ حشام میں واقع خاندانِ صدیقی کا آبائی قبرستان

جسمانی عارضہ

زندگی، جو ہمیشہ آزمائش اور راحت کے امتزاج سے عبارت ہوتی ہے، ایک بار پھر حضرت والدِ گرامی کو ایک نہایت کٹھن اور اضطراب انگیز مرحلے سے گزارنے والی تھی۔ سنہ ۲۰۰۱ء میں اچانک حضرت والدِ محترم ایک شدید جسمانی عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ بیماری کی شدت اس قدر تھی کہ اُن کا جسمانی توازن متاثر ہو گیا، چلنا پھرنا دشوار ہو گیا، اور ہاتھوں سے معمول کے امور انجام دینا بھی مشکل محسوس ہونے لگا۔

یہ صورتحال پورے گھر کے لیے شدید ذہنی اضطراب، بے چینی اور آزمائش کا سبب بن گئی۔ خصوصاً راقمِ سطور اُس وقت میکانیکل انجینئرنگ کے دوسرے سال میں زیرِ تعلیم تھا، اور حضرت والدِ محترم کی اس اچانک بگڑتی ہوئی صحت نے میرے قلب و ذہن کو شدید طور پر مضطرب کر دیا۔ ایک طرف تعلیمی ذمہ داریاں تھیں اور دوسری جانب والدِ محترم کی تشویشناک حالت، یہ وہ وقت تھا جب زندگی پہلی مرتبہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ میرے سامنے کھڑی محسوس ہوئی۔

حضرت والدِ گرامی کے علاج کی غرض سے ہم انہیں بنگلور لے گئے، جہاں اُن کے معائنے اور علاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُس زمانے کی ذہنی کیفیت اس قدر پریشان کن تھی کہ میں اپنے امتحانات تک مکمل نہ کر سکا اور شدید اضطراب کے باعث اُنہیں ترک کرنا پڑا۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت، بزرگوں کی دعاؤں اور طبی علاج کے نتیجے میں حضرت والدِ محترم بتدریج صحت یاب ہونے لگے، اور یہ پورے گھر کے لیے ایک عظیم سکون اور شکرگزاری کا لمحہ تھا۔

ان آزمائش بھرے ایام میں محترم مشہود بھائی نے جس بے مثال خلوص، قربانی اور جذباتی وابستگی کا مظاہرہ کیا، وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ نہ صرف عملی طور پر ہر ضرورت کے وقت موجود رہے بلکہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر بھی ہمارے لیے ایک مضبوط سہارا بنے رہے۔ اُن کی شخصیت حضرت والدِ گرامی کے لیے اُس وفادار نسل کی نمائندہ تھی جس نے اپنے بزرگوں کی خدمت کو صرف خاندانی فریضہ نہیں بلکہ سعادت سمجھا۔ اور اسی طرح اُن کی موجودگی حضرت والدِ محترم کے لیے اعتماد، سکون اور خاندانی استحکام کی علامت بن چکی تھی۔

علاج اور صحت یابی کے بعد جب حضرت والدِ گرامی واپس گلبرگہ تشریف لائے تو ڈاکٹروں نے اُنہیں آرام، احتیاط اور باقاعدہ ورزش کا مشورہ دیا۔ انہی دنوں وہ وقتاً فوقتاً قلعہ میں مقیم اپنے برادرانِ اکابر سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس مرحلے میں اُن کے ایک اور

بھتیجے، محترم مبشر بھائی جو حضرت والدِ محترم کے دوسرے بڑے بھائی کے دوسرے صاحبزادے تھے، بھی اُن کے ساتھ نہایت محبت، ادب اور خلوص کے ساتھ موجود رہتے۔

یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اب خاندان کی نئی نسل بھی تدریجاً ذمہ داریوں کو سنبھالنے، بزرگوں کی خدمت کرنے، اور خاندانی نظام کو مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھانے کے قابل ہو چکی ہے۔ حضرت والدِ گرامی کے بھتیجے صرف رشتہ دار نہ تھے بلکہ اُن کے لیے اعتماد، محبت، خدمت اور عملی معاونت کی جیتی جاگتی مثال بن گئے تھے۔

محترم مبشر بھائی اُن خوش نصیب بھتیجوں میں شمار ہوتے تھے جنہیں حضرت والدِ گرامی کی خصوصی محبت، غیر معمولی اعتماد اور قلبی قربت حاصل تھی۔ حضرت والدِ محترم کے دل میں اُن کے لیے محض خاندانی تعلق کا رسمی احساس نہ تھا بلکہ ایک گہری روحانی وابستگی، شفقت آمیز اپنائیت اور بے ساختہ اعتماد کی ایسی کیفیت موجود تھی جو ہر طرزِ گفتگو اور ہر معمولِ زندگی میں نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ حضرت والدِ گرامی مبشر بھائی کو اپنے انتہائی قریب تصور فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کے نہایت معمولی معاملات ہوں یا کسی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا تقاضا، حضرت والدِ محترم بے اختیار مبشر بھائی کو ہی یاد فرمایا کرتے۔ اُنہیں بارہا اپنے پاس بلانا، مختلف کاموں میں اُن پر اعتماد کرنا، اور اُن کے ساتھ وقت گزارنا حضرت والدِ گرامی کے قلبی سکون کا حصہ بن چکا تھا۔ گویا مبشر بھائی صرف ایک بھتیجے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ

حضرت والدِ محترم کی زندگی میں ایک ایسے مخلص رفیق، خدمت گزار اور وفادار سائے کی مانند تھے جن کی موجودگی اُنہیں قلبی اطمینان عطا کرتی تھی۔

ایک نہایت قابلِ ذکر اور جذباتی پہلو یہ بھی تھا کہ حضرت والدِ گرامی اپنی بعض ضروریات، اپنی فکری باتیں، اور روزمرہ کے تقاضے جس بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ مبشر بھائی سے بیان فرمایا کرتے تھے، وہ انداز اکثر مجھ سے بھی مختلف ہوتا تھا۔ یہ دراصل اُس گہرے اعتماد، خاموش سمجھ بوجھ، اور قلبی ہم آہنگی کی علامت تھی جو دونوں کے درمیان برسوں کی محبت، ادب اور خدمت کے نتیجے میں قائم ہو چکی تھی۔ محترم مبشر بھائی بھی حضرت والدِ گرامی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو، نشست و برخاست، خدمت اور طرزِ عمل میں ہمیشہ ایک خاص ادب، عقیدت اور محبت نمایاں رہتی۔ وہ اکثر ہمارے گھر تشریف لاتے، ہمارے ساتھ وقت گزارتے، اور گھر کے ماحول میں ایسی اپنائیت اور خلوص کی فضا پیدا ہو جاتی جو خاندانی رشتوں کی اصل خوبصورتی کی عکاس تھی۔ اُن کی موجودگی محض ایک مہمان یا عزیز کی آمد محسوس نہ ہوتی بلکہ گویا گھر کا ایک لازمی حصہ اپنے ہی ماحول میں شامل ہو گیا ہو۔

اس خاکسار کا تعلق بھی محترم مبشر بھائی کے ساتھ نہایت قریبی، مخلصانہ اور گہرے جذباتی ربط پر قائم تھا۔ یہ تعلق محض کزن ہونے کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اُس میں دوستی، بھائی چارہ، اعتماد، راز داری اور قلبی وابستگی کی ایسی کیفیت شامل تھی جو زندگی کے مختلف ادوار میں مزید

مضبوط ہوتی چلی گئی۔ ہم نے نہ صرف خاندانی لمحات بلکہ زندگی کی بے شمار خوشیاں، فکری گفتگوئیں، اور آزمائشوں کے ایام بھی ایک دوسرے کے ساتھ گزارے۔



درحقیقت محترم مبشر بھائی اُن شخصیات میں تھے جنہوں نے اپنے اخلاق، محبت، خدمت کے ذریعے حضرت والدِ گرامی کے قلب میں ایک مستقل اور محترم مقام حاصل کیا۔ وہ نئی نسل کے اُن نمایاں افراد میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے بزرگوں کی خدمت، خاندانی تعلقات کی پاسداری، اور محبت و احترام کی روایات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ زندہ رکھا۔

جیسے کے پچھلے صفحات پر فاطمہ صدیقہ اردو سکول میں والدِ محترم کی عملی سرگرمی کے متعلق بتایا گیا تھا، اسی اثنا میں حضرت والدِ گرامی نے اپنی بڑھتی ہوئی عمر، صحت کی نزاکتوں، اور دیگر مصروفیات کے پیشِ نظر اسکول کی عملی و انتظامی ذمہ داریوں سے بتدریج خود کو الگ فرمایا۔

اگرچہ حضرت والدِ محترم نے بظاہر اس ادارے سے کنارہ کشی اختیار کرلی، لیکن اُن کے قلب میں غریب بچیوں کی تعلیم، اُن کی ترقی، اور اردو زبان وتہذیب کے فروغ کی فکر ہمیشہ زندہ رہی۔ اُن کی نیت، اُن کا اخلاص، اور اُن کی برسوں پر محیط خاموش خدمات یقیناً اُن اعمالِ صالحہ میں شامل ہیں جو معاشرے کی تعمیر اور آنے والی نسلوں کی فکری آبیاری میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

جب حضرت والدِ گرامی نے باقائدہ اس زمہ داری سے استعفی دے دیا، تو قدرت نے اس تعلیمی مشن کی بقا، ترقی اور استحکام کے لیے خاندان ہی کے ایک نہایت باصلاحیت، فعال اور علم دوست فرد کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ ذمہ داری حضرت والدِ محترم کے بھانجے، جناب قاضی حامد فیصل صدیقی صاحب نے اپنے کندھوں پر سنبھالی، جو حضرت والدِ گرامی کی محبّ ہمشیرہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔

جناب فیصل بھائی صاحب اپنے خاندانی وقار، علمی عظمت، دینی وابستگی، انتظامی بصیرت، اور سماجی خدمات کے اعتبار سے گلبرگہ کے ممتاز اور بااثر شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف اردو زبان وادب کے میدان میں اعلیٰ علمی مقام رکھتے ہیں بلکہ اردو میں ڈاکٹریٹ (Ph.D.) کی سند کے حامل ایک صاحبِ تحقیق، صاحبِ علم اور فکری شخصیت بھی ہیں۔ اُن کی علمی گفتگو، ادبی ذوق، اور تحقیقی مزاج اُنہیں علمی حلقوں میں ایک منفرد وقار عطا کرتا ہے۔

وہ دفترِ قضاۃ گلبرگہ کے سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں اور خاندانی طور پر منصبِ قضاء کے وارث ہونے کے باعث اُنہیں ایک باقاعدہ مقررہ اختیاراتی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس منصب کے ساتھ وابستہ دینی، سماجی اور شرعی ذمہ داریوں کو وہ نہایت وقار، دیانت، فہم و تدبر، اور سنجیدہ انتظامی صلاحیت کے ساتھ نبھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ جامعہ مسجد قلعہ حشام گلبرگہ کے متولی بھی ہیں، جو شہر کی قدیم، تاریخی اور روحانی اہمیت کی حامل مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ مزید برآں، وہ قلعہ کے آبائی قبرستان کے بھی متولی ہیں، اور اس حیثیت سے خاندانی و دینی امانتوں کی حفاظت، نگرانی اور خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

فیصل بھائی صاحب کی شخصیت میں علمی وقار کے ساتھ غیر معمولی فعالیت، انتظامی ذہانت، سماجی شعور، اور رفاہی جذبہ بدرجہِ اتم موجود ہے۔ وہ نہایت متحرک، دور اندیش، ذہین، معاملہ فہم، اور وسیع النظری کے حامل انسان ہیں۔ اُن کے مزاج میں ایک خوشگوار توازن پایا جاتا ہے جہاں دینی وقار، جدید انتظامی انداز، سماجی خدمت، اور خاندانی روایات ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔

وہ فطرتاً نہایت فیاض، اور رفاہی سوچ رکھنے والے فرد ہیں۔ معاشرے کے مختلف طبقات، خصوصاً تعلیمی وسماجی میدانوں میں اُن کی دلچسپی اور سرگرمیاں اُن کے وسیع القلب اور خدمت گزار مزاج کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی شخصیت میں قیادت کی وہ فطری صلاحیت موجود ہے جو لوگوں کو منظّم کرنے، اداروں کو ترقی دینے، اور بکھرے ہوئے نظام کو مؤثر انداز میں استحکام بخشنے کی غیر معمولی قدرت رکھتی ہے۔

چنانچہ جب فاطمہ صدیقہ اردو گرلس ہائی اسکول کی ذمہ داریاں اُن کے سپرد ہوئیں تو انہوں نے نہایت پیشہ ورانہ مہارت، انتظامی بصیرت، اور مسلسل محنت کے ساتھ اس ادارے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ حضرت والدِ گرامی نے جس ادارے کی بنیادوں کو اخلاص، قربانی اور برسوں کی محنت سے مضبوط کیا تھا، فیصل بھائی صاحب نے اُسے جدید تقاضوں، منظّم انتظامیہ، تعلیمی بہتری، اور فعال حکمتِ عملی کے ذریعے ترقی کی نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

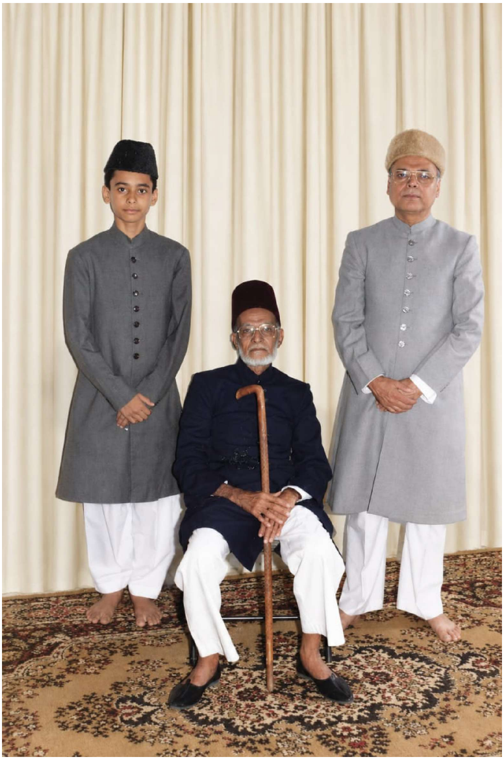
یہ اُن کی غیر معمولی صلاحیت اور انتظامی قوت کا مظہر تھا کہ جس مقام تک پہنچنے میں حضرت والدِ گرامی اور دیگر بزرگوں کو طویل عرصہ درکار ہوا، اُسے انہوں نے نسبتاً مختصر مدت میں مزید ترقی، استحکام اور وسعت عطا کردی۔ اُن کی قیادت میں ادارے نے نہ صرف تعلیمی میدان میں بہتر مقام حاصل کیا بلکہ نظم و نسق، عوامی اعتماد، اور تعلیمی معیار کے اعتبار سے بھی نمایاں ترقی کی۔

درحقیقت فیصل بھائی صاحب اُن خوش نصیب افراد میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے بزرگوں کی قائم کردہ روایات، علمی خدمات، دینی وقار، اورسماجی ذمہ داریوں کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ انہیں نئے دور کے تقاضوں کے مطابق مزید مؤثر، فعال اور کامیاب بنانے کی عملی کوشش کی۔ اُن کی شخصیت خاندان کے علمی و دینی ورثے کی ایک روشن اور قابلِ فخر نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔

دو دائمی صدمے

سنہ ۲۰۰۳ء حضرت والدِ گرامی کی حیات میں ایک بار پھر غم و اندوہ کے ایسے سیاہ بادل لے کر طلوع ہوا جس نے اُن کے قلبِ حساس کو شدید طور پر مضطرب اور غمگین کر دیا۔ زندگی کے طویل سفر میں بے شمار آزمائشیں، جدائیاں اور صدمات سہنے کے باوجود یہ سال اُن کے لیے نہایت جاں گسل اور روح فرسا ثابت ہوا۔

تویل علالت کے بعد محترم دادا حضرت صاحب اس دنیاِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ ان کے وصال کی خبر نے پورے خاندان کو سوگوار کر دیا۔ اگرچہ وقت، حالات اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز نے تعلقات کو اپنی مخصوص جہات عطا کر دی تھیں، لیکن باپ بہر حال باپ ہوتا ہے، اور اُس کی جدائی انسان کے وجود میں ایک خاموش خلا ضرور چھوڑ جاتی ہے۔ حضرت والدِ گرامی نے اپنے والدِ محترم کے انتقال کو نہایت صبر، خاموشی اور تقدیرِ الٰہی پر رضا کے جذبے کے ساتھ برداشت کیا، لیکن اس سانحے نے اُنہیں باطن میں ایک بار پھر ماضی کی یادوں اور زندگی کی ناپائیداری کے احساس سے دوچار کر دیا۔



مگر شاید تقدیر ابھی اِس گھر کے لیے مزید امتحان اپنے دامن میں لیے بیٹھی تھی۔ حضرت دادا جان کے وصال کے کچھ ہی عرصے بعد وہ سانحہ رونما ہوا جس نے بیتِ عزیز کی فضاؤں سے مسکراہٹوں کی روشنی چھین لی اور حضرت والدِ گرامی کے قلب کو اندر تک توڑ کر رکھ دیا۔

حضرت والدِ محترم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے، ہمارے نہایت عزیز اور ہر دلعزیز بھائی، ابوالخیر احمد عزیر صدیقی، اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ اگرچہ جسمانی اعتبار سے

کمزور صحت کے حامل تھے، لیکن اُن کی شخصیت میں عزم، خود اعتمادی، جرائت اور زندہ دلی کی ایسی غیر معمولی کیفیت موجود تھی جو ہر شخص کو متاثر کیے بغیر نہ رہتی۔

ہر دلعزیز عزیر مرحوم نہایت خوش مزاج، شگفتہ طبیعت، محبت کرنے والے اور محفلوں کو ہنسی سے آباد کر دینے والی شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی باتوں میں بے ساختہ شوخی، مزاح میں معصومیت، اور اندازِ گفتگو میں ایسی دلکشی تھی کہ اُن کی موجودگی ہر ماحول کو خوشگوار بنا دیتی۔ وہ خاندان کے ہر فرد، ہر عزیز اور ہر دوست کے ساتھ نہایت جلد گھل مل جاتے۔ اُن کی طبیعت میں ایک غیر معمولی اپنائیت، بے تکلفی اور خلوص پایا جاتا تھا۔

وہ نہایت ملنسار، جری، خود اعتماد اور کھلے مزاج کے حامل نوجوان تھے۔ اُن کی شخصیت میں جوانی کا ولولہ، معصوم شوخی اور محبت کی حرارت اس انداز سے یکجا تھی کہ وہ بہت کم عرصے میں ہر دل عزیز بن گئے۔ بیتِ عزیر کی فضاؤں میں اُن کی ہنسی، اُن کی آواز، اُن کے لطیفے اور اُن کی معصوم شرارتیں گویا زندگی کی علامت بن چکی تھیں۔

لیکن قدرت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ ابھی اُنہوں نے زندگی کے رنگوں کو پوری طرح دیکھا بھی نہ تھا، خوابوں کی تعبیرات کو محسوس بھی نہ کیا تھا، اور جوانی کے افق پر قدم ہی رکھا تھا کہ محض انیس برس کی نہایت کم عمر میں نیمونیا کے سبب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بیتِ عزیر کا عزیر

خاموش ہو گیا۔ اُن کی جدائی نے پورے خاندان کو غم، سناٹے اور نا قابلِ بیان حسرت میں مبتلا کر دیا۔ گھر کے در و دیوار اُن کی آواز کے منتظر رہنے لگے، محفلیں اُن کی شوخیوں کے بغیر ادھوری محسوس ہونے لگیں، اور ہر چہرے پر اُن کی یاد کا ایک خاموش سایہ چھا گیا۔ وہ واقعی سب کے محبوب تھے — بزرگوں کے لاڈلے، بہن بھائیوں کے دل کا سکون، کزنز کے محبوب ساتھی، اور دوستوں کی محفلوں کی جان۔

حضرت والدِ گرامی کے لیے تو یہ سانحہ گویا اُن کے وجود کا ایک حصہ جدا ہو جانے کے مترادف تھا۔ وہ بیٹا، جو اُن کی آنکھوں کا نور، اُن کے بڑھاپے کی خوشی، اور اُن کے قلب کی نرم ترین دھڑکن تھا، اچانک اُن سے جدا ہو گیا۔ حضرت والدِ محترم، جنہوں نے زندگی میں بے شمار صدمات کو صبر، وقار اور ضبط کے ساتھ برداشت کیا تھا، اس مرتبہ اندر سے ٹوٹ گئے۔

ایک باپ کے دل پر اولاد کی جدائی جو قیامت برپا کرتی ہے، اُسے الفاظ کی کوئی زبان پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔ حضرت والدِ گرامی کی آنکھوں میں وہ خاموش غم، وہ ٹوٹا ہوا سکون، اور وہ بے آواز درد مدتوں محسوس کیا جاتا رہا۔ لیکن اس شدید صدمے کے باوجود اُنہوں نے تقدیرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھا، صبر کو اپنا سہارا بنایا، اور اپنے باطن کے زخموں کو خاموشی، دعا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر یقین کے ساتھ برداشت کیا۔

ہو گیا اکیلا دل بن تمہارے بھائی میرے
دور ہوکر مجھ سے دیا تم نے غم دل کو میرے
اداس کیا مایوس پھرتا ہوں میں مارا مارا
نہیں کوئی رہا اب سننے والا دل کے حالات میرے

مسکراہٹ سے تمہارے، زندگی روشن تھی ہماری
روشن نہیں بلکہ رونق تھی زندگی ہماری
تصور بھی نہ تھا چھوڑ کر ہمیں تم جاوگے اس طرح
اُڑ گئے رنگ خشیوں کے ، پڑ گئی پھیکی زندگی ہماری

تھے لاکھوں میں تم عزیز، آنکھ کے تارے تھے تم
لخط جگر تھے تم، دھڑکن نہیں بلکہ دل ہی تھے تم
آتا ہے یاد جب بھی رخصتی کا وقت ہم سے تمہارا
بن کر آنسوں آنکھوں سے ہمارے ٹپکتے ہو تم

یا اللہ رحمت تیری غالب ہے جلال پر تیرے
بخش دے گناہ سارے مرحوم بھائی کے میرے
عطا کر ٹھنڈک بہشت کی، سکون و راحت جنت کی
رحمت کی چھاوں عطا کر مقدس سائے میں تیرے

یوں سنہ ۲۰۰۳ء حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں ایک ایسا باب بن گیا جس نے بیتِ عزیز کی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے اشکبار کر دیا، اور جس کی یاد آج بھی دلوں میں ایک خاموش کسک کی صورت زندہ ہے۔

زندگی اپنے معمول کے مطابق آزمائشوں، خوشیوں اور روزمرہ کی بے شمار کیفیات کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ بعض حالات ایسے بھی آئے جو اگرچہ وقتی طور پر اہم محسوس ہوتے تھے، مگر حیات کے عظیم تر سفر میں اُن کی حیثیت محض گزر جانے والے مراحل کی سی تھی، اس لیے اُن کے تفصیلی ذکر کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل، بزرگوں کی دعاؤں، اور حضرت والدِ گرامی کی تدبر آمیز سرپرستی کے باعث زندگی کا کارواں اپنے اعتدال اور وقار کے ساتھ رواں دواں رہا۔



قلبی اطمینان

پھر سنہ ۲۰۰۴ء ہماری زندگی میں ایک نہایت اہم، یادگار اور مسرت آفریں مرحلہ لے کر آیا۔ الحمدللہ، اُس سال راقمِ سطور نے میکانیکل انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کی۔ یہ کامیابی محض ایک تعلیمی مرحلے کی تکمیل نہ تھی بلکہ حضرت والدِ گرامی کی برسوں کی محنت، دعاؤں، قربانیوں اور تعلیمی ترجیحات کا ایک روشن ثمر تھی۔ اُن کے لیے یہ لمحہ ایک ایسے باغبان کی مسرت جیسا تھا جس نے طویل عرصے تک محنت، صبر اور امید کے ساتھ ایک پودے کی آبیاری کی ہو اور اب اُسے تناور درخت بنتا دیکھ رہا ہو۔



حضرت والدِ محترم اس بات پر قلبی اطمینان محسوس کر رہے تھے کہ اب اُن کا فرزند زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے، ذمہ داریوں کو سمجھنے، اور مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی وفکری طور پر بالغ اور تیار ہو چکا ہے۔ گویا میری تعلیمی تکمیل اُن کے لیے صرف ایک ڈگری کا حصول نہ تھی بلکہ اپنی تربیت، اپنی جدوجہد اور اپنی ذمہ داریوں کی ایک بڑی کامیابی تھی۔

میں اُس وقت زندگی کے ایک نئے باب کے آغاز کے لیے اپنے خوابوں، عزائم اور عملی منصوبوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن مجھے اس بات کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ میرے محترم والدین خاموشی، تدبر اور خاندانی بصیرت کے ساتھ میری آئندہ زندگی کے متعلق پہلے ہی ایک نہایت اہم اور بابرکت فیصلہ کر چکے ہیں۔

حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ ماجدہ نے نہایت غور وفکر، دعا، مشاورت اور خاندانی اقدار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خاندان کے وسیع دائرے میں سے میرے لیے ایک ایسی رفیقۂ حیات کا انتخاب فرمایا جسے وہ نہ صرف میرے لیے موزوں سمجھتے تھے بلکہ اُسے اپنے گھر، اپنی تربیت اور اپنی خاندانی روایت کے لیے بھی ایک بہترین اضافہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ نہایت سادگی، وقار اور خاندانی محبت کے ماحول میں میری منگنی کا اعلان کیا گیا۔ یہ نسبت حضرت والدِ گرامی کی نہایت محبوب اور عزیز ہمشیرہ، محترمہ مصرت صدیقہ صاحبہ (جنہیں ہم سب بڑی پھوپھو کے نام سے یاد کرتے ہیں) کی چوتھی شہزادی کے ساتھ طے پائی۔





یہ باوقار، مہذب اور منفرد شخصیت کی حامل خاتون، رضوانہ فاطمہ نمیرہ صدیقہ صاحبہ تھیں، جن کی اصل خوبصورتی صرف ظاہری وجاہت تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کے باطن، اُن کے اخلاق، اُن کے نظم وضبط، اور اُن کے مثبت طرزِ فکر میں جلوہ گر تھی۔ اُن کی شخصیت میں دینی شعور، وسیع النظری، سادگی، متانت اور نسوانی وقار کا ایسا حسین امتزاج موجود تھا جو ہر صاحبِ شعور کو متاثر کیے بغیر نہ رہتا۔

وہ نہایت مذہبی مزاج، پاکیزہ عادات، سنجیدہ فکر اور اعلیٰ اخلاق کی حامل خاتون تھیں۔ اُن کی گفتگو میں شائستگی، طبیعت میں توازن، مزاج میں نرمی، اور سوچ میں ایک وسیع اور مثبت انداز نمایاں تھا۔ اُن کی شخصیت میں مشرقی روایات کی حیا اور وقار کے ساتھ ساتھ فکری پختگی اور بلند ظرفی کی بھی ایک خاص جھلک موجود تھی۔ حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ ماجدہ کو یقین تھا کہ یہ رشتہ نہ صرف دو افراد کا تعلق ہوگا بلکہ دو ایسی فکری، اخلاقی اور خاندانی قدروں کا حسین امتزاج ثابت ہوگا جو آئندہ زندگی کو سکون، محبت اور استحکام عطا کرے گا۔

یوں سنہ ۲۰۰۴ء نہ صرف میری تعلیمی زندگی کی تکمیل کا سال ثابت ہوا بلکہ یہ میری آئندہ ازدواجی اور عملی زندگی کے ایک نئے، بابرکت اور روشن باب کے آغاز کی تمہید بھی بن گیا۔ اگرچہ بظاہر میری تعلیمی مسافت ایک اہم مرحلے کو عبور کر چکی تھی اور میکانیکل انجینئرنگ کی ڈگری کے بعد عملی زندگی اور پیشہ ورانہ میدان میں قدم رکھنے کا وقت قریب محسوس ہو رہا تھا، لیکن حضرت والدِ گرامی کی بصیرت محض وقتی کامیابیوں یا جلد بازی پر مبنی فیصلوں تک محدود نہ تھی۔ اُن کی نگاہ ہمیشہ مستقبل کے وسیع تر امکانات، زمانے کے بدلتے تقاضوں، اور آنے والے ادوار کی سخت مسابقت پر مرکوز رہتی تھی۔

حضرت والدِ محترم نے نہایت تدبر، گہرے مشاہدے اور پدرانہ دور اندیشی کے ساتھ یہ محسوس فرمایا کہ موجودہ دور میں صرف بنیادی ڈگری انسان کو اُس مضبوط مقام تک نہیں پہنچا سکتی

جہاں وہ عملی میدان کی شدید رقابتوں میں مستقل وقار اور استحکام کے ساتھ اپنا مقام برقرار رکھ سکے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کا فرزند صرف روزگار حاصل کرنے والا فرد نہ بنے بلکہ علمی اعتبار سے اس قدر مستحکم، فکری طور پر اس قدر پختہ، اور پیشہ ورانہ اعتبار سے اس قدر مضبوط ہو کہ ہر مسابقتی میدان میں اعتماد اور کامیابی کے ساتھ نمایاں ہو سکے۔

چنانچہ حضرت والدِ گرامی نے نہایت حکمت اور سنجیدہ مشورے کے ساتھ مجھے فوری طور پر ملازمت کی دنیا میں قدم رکھنے کے بجائے اپنی تعلیم کو مزید آگے بڑھانے کی تلقین فرمائی۔ اُنہوں نے یہ رائے نہ صرف ایک والد کی محبت کے تحت دی بلکہ ایک ایسے تجربہ کار، زمانہ شناس اور دور اندیش انسان کی حیثیت سے دی جو زندگی کے عملی دنیا کی حقیقتوں، اور مستقبل کی ضروریات کو گہرائی سے سمجھتا تھا۔

حضرت والدِ محترم کی گفتگو میں ہمیشہ ایک خاص قسم کی فکری پختگی اور خیر خواہی موجود ہوتی تھی۔ اُنہوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ مضبوط تعلیمی بنیاد انسان کے مستقبل کو صرف معاشی استحکام ہی نہیں دیتی بلکہ اُسے اعتماد، وقار اور فیصلہ سازی کی وہ قوت عطا کرتی ہے جو پوری زندگی اُس کے کام آتی ہے۔ اُن کے نزدیک اعلیٰ تعلیم صرف ڈگری حاصل کرنے کا نام نہ تھا بلکہ شخصیت سازی، فکری وسعت، اور مستقبل کی مضبوط تعمیر کا ایک بنیادی ستون تھی۔

چنانچہ اُن کی رہنمائی، دعاؤں اور مکمل اعتماد کے زیرِ سایہ میں نے مزید اپنی تعلیمی مسافت جاری رکھی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ فیصلہ بظاہر ایک اضافی تعلیمی مرحلہ محسوس ہوتا تھا، لیکن حقیقت میں یہ حضرت والدِ گرامی کی نہایت باریک بین، غیر معمولی اور دوررس منصوبہ بندی کا حصہ تھا، جس کا مقصد اپنی اولاد کے مستقبل کو صرف محفوظ بنانا نہیں بلکہ اُسے عزت، استحکام اور برتری کے ایسے مقام تک پہنچانا تھا جہاں زمانے کی سختیاں اور مسابقتی چیلنجز اُس کے لیے رکاوٹ نہ بن سکیں۔

درحقیقت حضرت والدِ محترم کی شخصیت کا یہی امتیاز تھا کہ وہ ہر معاملے کو وقتی جذبات یا ظاہری سہولت کے بجائے طویل المدتی استحکام، مستقبل کی ضرورت، اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے زاویے سے دیکھتے تھے۔ اُن کی یہی حکمت، منصوبہ بندی اور تعلیمی بصیرت بعد کے زمانوں میں ہماری زندگیوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوئی، جس کا احساس وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔

مسجدِ منظور

وقت اپنی خاموش رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، اور حضرت دادا جان کے وصال کو تقریباً دو برس بیت چکے تھے۔ انہی ایام میں حضرت والدِ گرامی کے قلب میں ایک ایسا خواب دوبارہ بیدار ہوا جو درحقیقت اُن کے باطن میں تقریباً تین دہائیوں سے خاموشی کے ساتھ زندہ تھا۔ یہ محض ایک تعمیری منصوبہ نہ تھا بلکہ محبتِ والد، ایصالِ ثواب، دینی وابستگی، اور شکرِ نعمت کے جذبات سے معمور ایک عظیم روحانی آرزو تھی — اپنے والدِ محترم کے نام پر ایک مسجد کی تعمیر۔

حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں بے شمار آزمائشیں، ذمہ داریاں، تعلیمی اخراجات، خاندانی تقاضے اور معاشی منصوبہ بندیاں رہی تھیں، لیکن ان تمام مصروفیات اور حالات کے باوجود اُن کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ ایک خاموش چراغ کی مانند روشن رہی کہ ایک دن وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر کا شرف حاصل کریں اور اُس مقدس عمل کو اپنے والدِ محترم محمد منظور الحق صدیقی مرحوم کے نام سے منسوب کریں۔

اگر اُس وقت کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو بظاہر اس خواب کی تعبیر کے لیے اسباب مکمل طور پر سازگار نہ تھے۔ حضرت والدِ گرامی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، کوئی مستقل آمدنی باقی نہ تھی، اور میری اعلیٰ تعلیم کے اخراجات و ذمہ داریاں بھی جاری تھیں۔ ظاہری عقل و حساب کے اعتبار سے یہ وقت ایک عظیم دینی منصوبے کے آغاز کے لیے نہایت مشکل تصور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن حضرت والدِ محترم کی شخصیت ہمیشہ ظاہری حسابات سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، برکت اور غیبی نصرت پر یقین رکھنے والی شخصیت تھی۔

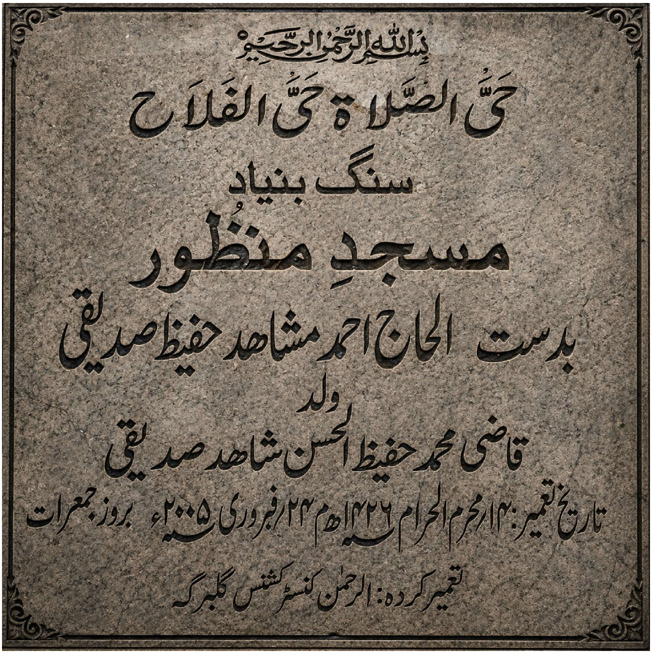
چنانچہ فروری ۲۰۰۵ء میں حضرت والدِ گرامی نے نہایت اخلاص، توکل، عاجزی اور شکرگزاری کے جذبات کے ساتھ اسلام آباد کالونی میں مسجدِ منظور کی بنیاد رکھنے کا مبارک فیصلہ فرمایا۔ یہ فیصلہ دراصل اُن تمام نعمتوں، کامیابیوں، حفاظتوں، برکتوں اور رحمتوں پر اللہ تعالیٰ کے حضور ایک خاموش سجدۂ شکر تھا جو حضرت والدِ محترم کو اُن کی پوری زندگی میں عطا ہوئی تھیں۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا قدم محسوس ہوتا تھا، لیکن حقیقت میں یہ حضرت والدِ گرامی کی حیات کا ایک عظیم ترین روحانی انقلاب اور کامیابی کا ایسا درخشاں باب تھا جس نے ثابت کر دیا کہ انسان کی اصل کامیابی صرف دنیاوی استحکام میں نہیں بلکہ ایسے اعمالِ خیر میں مضمر ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں اُس کے لیے نور، برکت اور صدقۂ جاریہ بن جائیں۔

حضرت والدِ محترم کے محبوب بھتیجے، محترم مشہود بھائی، نے اس مبارک منصوبے کی عملی ذمہ داری نہایت اخلاص، محبت اور لگن کے ساتھ اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ انہوں نے تعمیراتی امور، نگرانی، انتظامات اور مختلف ضروریات کو اس انداز سے سنبھالا گویا یہ اُن کی اپنی قلبی آرزو ہو۔ اُن کی شب و روز محنت، حضرت والدِ گرامی سے محبت، اور مسجد کے ساتھ روحانی وابستگی نے اس منصوبے کو ایک غیر معمولی قوت عطا کی۔

اسی کے ساتھ اسلام آباد کالونی کے مخلص، دیندار اور خیر خواہ مکین بھی نہایت فراخ دلی اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس مقدس تعمیر میں شریک ہونے لگے۔ کسی نے مالی تعاون کیا، کسی نے عملی خدمت پیش کی، کسی نے دعاؤں کا سہارا دیا، اور کسی نے اپنی استطاعت کے مطابق حصہ ڈالا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر سمت سے غیبی اسباب، محبتیں، تعاون اور برکتوں کے دروازے کھول دیے ہوں۔

واقعی یہ منظر حضرت والدِ گرامی کے لیے نہایت روح پرور اور ایمان افروز تھا کہ ایک خواب، جو برسوں سے اُن کے دل میں خاموشی سے زندہ تھا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔



الحمدللہ، بہت ہی مختصر عرصے میں مسجدِ منظور کی تعمیر مکمل ہوگئی اور یہ مبارک مسجد پنج وقتہ نماز کے لیے آباد ہوگئی۔ اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں، سجدوں کی رونقیں قائم ہوگئیں، اور اُس مقام پر اللہ تعالیٰ کے ذکر، عبادت اور بندگی کا نور پھیلنے لگا۔

یوں مسجدِ منظور محض ایک عمارت نہ رہی بلکہ حضرت والدِ گرامی کی پوری زندگی کی محنت، اُن کے والد سے محبت، اُن کے ایمان، اُن کے شکر، اور اُن کی روحانی کامیابی کا ایک دائمی نشان بن گئی — ایک ایسا صدقۂ جاریہ جو اِن شاء اللہ اُن کے لیے دنیا و آخرت میں رحمت، مغفرت اور بلندیِ درجات کا وسیلہ بنتا رہے گا۔


سنگِ بنیاد
مَسجِدِ مَنظُور











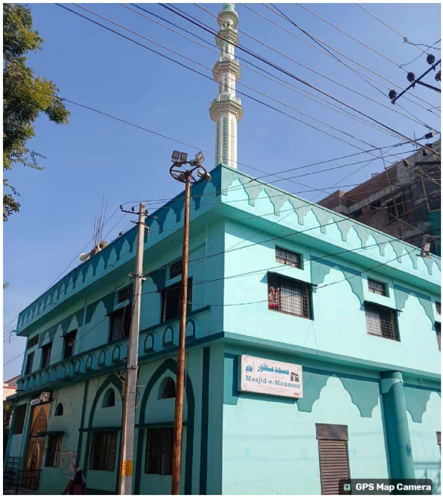
حضرت والدِ گرامی کی دینی بصیرت، روحانی فکر اور صدقہِ جاریہ کے تصور نے صرف مسجد کی تعمیر پر اکتفانہ کیا، بلکہ اُن کے قلب میں یہ خواہش بھی شدت کے ساتھ موجود تھی کہ اس مقدس مقام کو محض عبادت گاہ تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے علمِ دین، تربیتِ اسلامی اور نسلِ نو کی اصلاح و تعلیم کا مرکز بھی بنایا جائے۔ چنانچہ مسجدِ منظور کے ساتھ ہی ایک دینی مکتب و مدرسہ کے قیام کا مبارک سلسلہ بھی آغاز پذیر ہوا، تاکہ اُس علاقے کے بچے قرآنِ مجید، دینی تعلیمات، اسلامی آداب اور بنیادی عقائدِ اسلامیہ سے روشناس ہو سکیں۔



یہ دراصل حضرت والدِ گرامی کی اُس دور اندیش فکر کا مظہر تھا جس کے مطابق کسی بھی معاشرے کی حقیقی اصلاح صرف عمارتوں سے نہیں بلکہ ایمان، علم اور تربیت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جس مقام پر اذان کی صدائیں بلند ہوں، وہیں قرآن کی تلاوت، دینی تعلیم، اور اسلامی تہذیب کی روشنی بھی نسلوں کے قلوب کو منور کرتی رہے۔

اسی روحانی جذبے کے تحت اس مدرسے کا نام اُن کے نہایت عزیز اور مرحوم فرزند، ابوالخیر احمد عزیر صدیقی کی نسبت سے مدرسہ ابوالخیر رکھا گیا۔ یہ نام محض ایک رسمی نسبت نہ تھی بلکہ ایک باپ کے قلب میں اپنے محبوب بیٹے کی یاد، محبت اور ایصالِ ثواب کے جذبے کی نہایت درد بھری اور روحانی ترجمانی تھی۔





حضرت والدِ گرامی کے لیے یہ فیصلہ انتہائی جذباتی اور معنی خیز تھا۔ وہ فرزند، جس کی معصوم ہنسی، شوخ طبیعت، اور زندگی سے بھرپور شخصیت نے بیتِ عزیر کی فضاؤں کو کبھی مسرتوں سے آباد رکھا تھا، اب جسمانی طور پر اس دنیا میں موجود نہ تھا؛ لیکن حضرت والدِ محترم نے اُس کی یاد کو محض آنسوؤں اور حسرتوں تک محدود نہ رہنے دیا بلکہ اُسے علمِ دین، قرآنِ کریم کی تعلیم، اور بچوں کی تربیت کے ایک دائمی سلسلۂ خیر سے وابستہ کر دیا۔

یوں مدرسہ ابوالخیر درحقیقت مرحوم عزیر کی یاد کا ایک ایسا نورانی استعارہ بن گیا جہاں ہر پڑھا جانے والا حرفِ قرآن، ہر سکھائی جانے والی دینی بات، اور ہر بچے کی زبان سے نکلنے والی تلاوت اُن کے لیے صدقہِ جاریہ اور باعثِ رحمت بنتی چلی گئی۔



وقت گزرنے کے ساتھ اس مدرسے میں معصوم بچوں کی آمد، قرآنِ پاک کی صدائیں، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی نے اُس مقام کو مزید روحانیت اور برکت سے بھر دیا۔ یوں مسجدِ منظور اور مدرسہ ابوالخیر ایک ساتھ مل کر حضرت والدِ گرامی کی دینی غیرت، روحانی فکر، خاندانی محبت، اور آخرت کی کامیابی کے لیے اُن کی گہری تڑپ کی ایسی زندہ یادگار بن گئے جن کی تاثیر اِن شاءاللہ آنے والی نسلوں تک باقی رہے گی۔

خاندانی کارواں کی توسیع

زمانہ اپنی مسلسل گردش کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور تقدیر حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں خوشیوں، آزمائشوں، کامیابیوں اور صدمات کے نئے نئے ابواب رقم کرتی رہی۔ انھی ایام میں سنہ ۲۰۰۶ء الحمدللہ میری اعلیٰ تعلیمی مسافت کی تکمیل کا سال ثابت ہوا، جب میں نے اپنی ماسٹرس ڈگری کامیابی کے ساتھ مکمل کی۔ قدرتِ الٰہی کا خاص کرم یہ ہوا کہ اسی دوران کالج ہی کے ذریعے مجھے ملازمت کے لیے منتخب بھی کرلیا گیا۔ یہ دراصل وہ حقیقی کامیابی تھی جسے حضرت والدِ گرامی برسوں پہلے اپنی بصیرت، دعاؤں اور دوراندیش منصوبہ بندی کے ذریعے دیکھ چکے تھے۔ اُنہوں نے جس صبر، حکمت اور تدبر کے ساتھ مجھے فوری ملازمت کے بجائے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا، اُس کا ثمر اب نمایاں صورت میں سامنے آرہا تھا۔ حضرت والدِ محترم کے لیے یہ لمحہ محض ایک پیشہ ورانہ کامیابی نہ تھی بلکہ اُن کی پدرانہ تربیت، فکری منصوبہ بندی اور مسلسل دعاؤں کی قبولیت کا ایک روشن مظہر تھا۔

پھر سنہ ۲۰۰۷ء میں میری ازدواجی زندگی کا مبارک باب شروع ہوا۔ یہ رشتہ، جو پہلے ہی خاندان کی دعاؤں، محبتوں اور بزرگوں کی رضا مندی سے طے پاچکا تھا، اب ایک باقاعدہ

روحانی بندھن کی صورت اختیار کر گیا۔ حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ ماجدہ کے چہروں پر اس موقع پر جو خوشی اور دعاؤں کی کیفیت تھی، وہ اُن کے دلوں کی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کی عکاس تھی۔

ہے آج دلنشیں دل سے دلکش دلدار کی شادی
چمکتی چاندنی سے ہے نورانی چاند کی شادی
خوشی کے گھونگٹ اور لباسِ محبت میں
ہے پیار بھری مشاھد اور نمیرہ کی شادی

دو نئے زندگیوں کا ہے یہ آغاض
میل ملاپ پیار محبت کا ہے یہ آغاض
بزرگوں کی دعاوں، ارمانوں اور تمناوں سے
ہوے ہیں دونوں خوشیوں سے سرفراز

مہک اٹھی، روشن ہوئی، رنگین ہوئی، شاداں ہوئی
خوش خوشی کے آنگن میں محفل یہ شاداب ہوئی
پھول برسائے قادر ومصرت، پھولے نہ سمائے شاھد وعشرت
خوشیوں کی برسات ہوئی رنگوں کی بوچھاڑ ہوئی

آمد پر سہیلی کے خوش آمد کرتے ہیں شمیسہ
گل نہیں، بچھا کر گلزار خوش آمدید کرتے ہیں ایسا
خدموں کو چومتے پھول یہ سارے، استقبال کرتے پیار سے سارے
مرحبا کہتے دل لبھا کر ایسا، کہتے ہیں تارے چاند کو جیسا

شور کی اس محفل میں تنہائی بھی لگ رہی ہے
عزیزوں کے ساتھ بھی کمی ایک عزیز کی لگ رہی ہے
وہ مسکراہٹ کی رونق گم ہے، گم ہے وہ چاند ہمارا
چار چاند کے باوجود کمی عزیر کی لگ رہی ہے

دامن میں نمیرہ کے کھلے کنول، چمیلی مہکے، برسے گلاب
آنگن میں مشاھد کے برسے رحمت، برست نعمت، مسرت کی آب
ہرسماء رہے پرنور، روح پور رہے مسرور پرکشش ہر وقت سہانا
دمکے زندگی انکی جیسے آفتاب، چمکے زندگی انکی جیسے ماہتاب

محفوظ رہیں ہر وقت کے مصیبت سے
بچائے مولی دونوں کو نظرِ بد سے
ہر نظر ہو نظرِ کرم ، اللہ کا رحم
ہے یہی دعا پروردگارِ عالم سے





اس کے بعد سنہ ۲۰۰۸ء میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھرانے کو ایک اور عظیم خوشی سے نوازا، جب میری بڑی صاحبزادی اُمّ القریٰ عروسہ صدیقہ کی ولادت ہوئی۔ یوں حضرت والدِ گرامی اور محترمہ والدہ ماجدہ پہلی مرتبہ دادا دادی بننے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ اس ننھی سی کلی کی آمد نے گھر کے ماحول میں معصومیت، محبت اور نئی نسل کی خوشبو بکھیر دی۔ حضرت والدِ محترم اپنی پوتی سے بے حد محبت فرمایا کرتے تھے، اور اُن کے چہرے پر ایک خاص نورانی مسرت نمایاں ہو جاتی جب وہ اُسے اپنی آغوش میں لیتے۔

پھر سنہ ۲۰۱۰ء میں میری ہمشیرہ کی شادی کی مبارک تقریب منعقد ہوئی، اور یوں خاندان میں ایک اور خوشگوار اور یادگار مرحلہ شامل ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت والدِ گرامی نے اپنی دیرینہ خاندانی روایات، وقار، اور محبت بھرے انداز کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔

بعد ازاں سنہ ۲۰۱۱ء میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اور بیٹی قرۃ العین صدف صدیقہ کی نعمت عطا فرمائی۔ یوں بیتِ عزیز ایک مرتبہ پھر ننھی معصوم آوازوں، کھلکھلاہٹوں اور نئی نسل کی محبتوں سے مہکنے لگا۔ حضرت والدِ گرامی اب عمر کے اُس مرحلے میں داخل ہو رہے تھے جہاں انسان دنیاوی مصروفیات سے نسبتاً فارغ ہو کر اولاد اور پوتیوں کی معصوم رفاقت میں قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔

وہ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ نہایت شفقت، محبت اور دلی مسرت کے ساتھ وقت گزارتے۔ اُن کی طبیعت میں بزرگانہ وقار کے ساتھ ایک نرم جذباتی کیفیت بھی ہمیشہ موجود رہی، اور یہی وجہ تھی کہ نئی نسل اُن سے بے حد مانوس اور قلبی طور پر وابستہ تھی۔

قلم سے خدمتِ قرآن کا اعزاز

چونکہ اب حضرت والدِ گرامی کے پاس نسبتاً زیادہ فراغت تھی، اس لیے انہوں نے اپنے اوقات کو دینی مشاغل اور روحانی مصروفیات کے لیے مخصوص کرنا شروع کر دیا۔ حضرت والدِ گرامی کی شخصیت کا ایک نہایت روح پرور، منفرد اور نورانی پہلو اُن کی خوشخطی، قرآنِ مجید سے قلبی وابستگی، اور کلامِ الٰہی کے ساتھ اُن کے روحانی تعلق میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں نہ صرف فطری طور پر نہایت حسین، متوازن اور دلآویز خط عطا فرمایا تھا بلکہ اُس حسنِ تحریر کو قرآنِ کریم کی خدمت کے لیے استعمال کرنے کی عظیم توفیق بھی مرحمت فرمائی۔

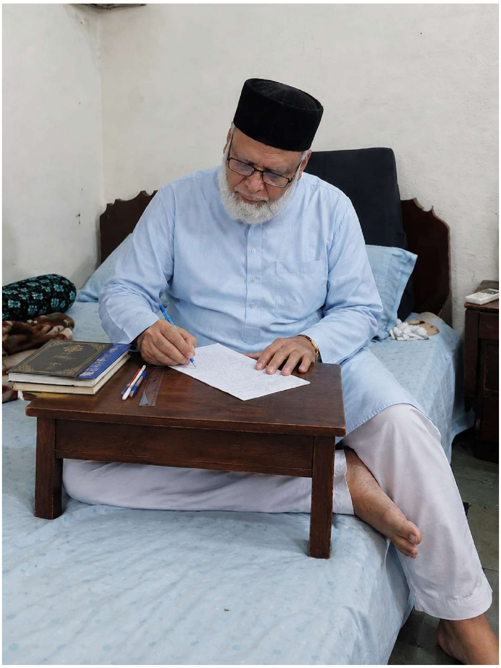
رفتہ رفتہ اُن کے قلب میں یہ نورانی جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے دستِ مبارک سے قرآنِ مجید تحریر کریں۔ بظاہر یہ ایک ایسا عظیم اور نہایت دشوار کام تھا جس میں غیر معمولی احتیاط، باریک بینی، صبر، روحانی انہماک، اور ہر حرف و حرکت کی بارہا جانچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معمولی تحریری غلطی بھی ناقابلِ برداشت ذمہ داری بن سکتی تھی۔ لیکن یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق اور باطنی عنایت تھی کہ جس کام کو عام نگاہ ایک انتہائی کٹھن اور دقیق ذمہ داری سمجھتی ہے، وہی کام حضرت والدِ محترم کے لیے روح کی تسکین، عبادت کی لذت، اور قلبی

سکون کا ذریعہ بنتا چلا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھوں میں قلم نہیں بلکہ اپنے کلام کی خدمت کا نور تھما دیا تھا۔ ابتدا میں جو ذمہ داری ایک پہاڑ کی مانند محسوس ہو سکتی تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی مدد، شوقِ ایمانی، اور مسلسل انہماک کے باعث پرندے کے پر کی مانند ہلکی محسوس ہونے لگی۔ حضرت والدِ گرامی نہایت خشوع، توجہ اور روحانی انہماک کے ساتھ قرآنِ مجید تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ہر حرف میں ادب، ہر سطر میں محبت، اور ہر صفحے میں عقیدت کی ایک خاموش جھلک نمایاں ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت والدِ محترم نے مکمل قرآنِ کریم کے پانچ نسخے اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمائے۔ یہ محض خوشخطی کا کارنامہ نہ تھا بلکہ عبادت، صبر، عشقِ قرآن، اور روحانی ریاضت کا ایک عظیم مظہر تھا۔ اُن کے محبوب بھتیجے، محترم مشہود بھائی نے بھی نہایت محبت اور اخلاص کے ساتھ ان نسخوں کی جلد بندی اور دیگر ضروری امور میں معاونت فرمائی، یوں یہ مقدس خدمت ایک خاندانی روحانی سعادت کی شکل اختیار کر گئی۔

ان پانچ مبارک نسخوں میں سے ایک نہایت قیمتی اور یادگار نسخہ حضرت والدِ گرامی نے اپنے سب سے بڑے برادرِ محترم، جناب فاروق صدیقی صاحب، کو بطورِ محبت، عقیدت اور عمر بھر کی وفادارانہ رفاقت و احسانات کے اعتراف کے طور پر پیش فرمایا۔ یہ محض ایک تحفہ نہ تھا بلکہ عمر بھر کی محبت، احترام، وفاداری، قربانیوں اور قلبی وابستگی کا ایک روحانی خراج تھا۔

لیکن وقت، جو ہر جسم پر اپنی کمزوریوں کے آثار چھوڑتا ہے، رفتہ رفتہ حضرت والدِ محترم کی صحت پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ عمر رسیدگی، جسمانی ضعف، اور مختلف عوارض کے باعث بالآخر اُنہیں پانچ نسخوں کے بعد اس مبارک سلسلے کو روکنا پڑا۔ تاہم جو کچھ وہ تحریر کر چکے تھے، وہی ایک غیر معمولی روحانی ورثہ، صدقہِ جاریہ، اور اُن کی حیاتِ ایمانی کی روشن علامت بن گیا۔





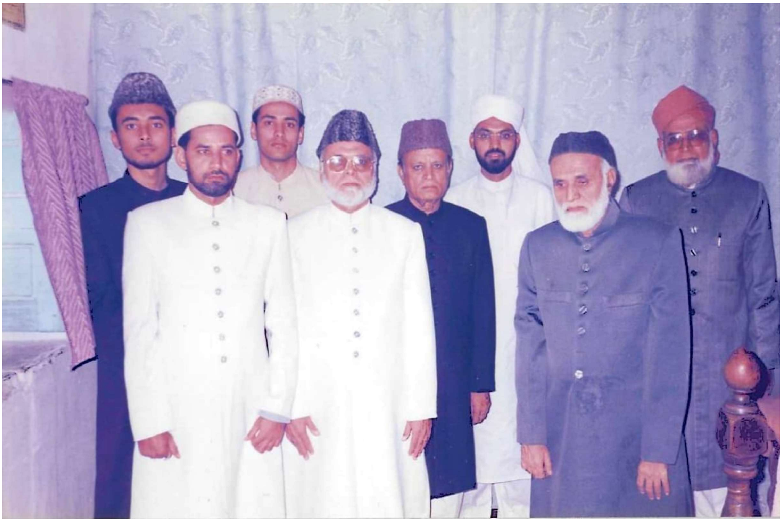
درحقیقت جب حضرت والدِ گرامی کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اُنہیں مختلف جہات میں خیر، خدمت اور نفع رسانی کے مواقع عطا فرمائے۔ مسجد کی تعمیر، مدرسے کا قیام، غریب بچیوں کی تعلیم کے لیے جدوجہد، خاندان کے افراد کی مالی معاونت، اہلِ خانہ کو حج وعمرہ کی سعادتوں تک پہنچانا، قرآنِ کریم کی کتابت، اور دینی وخاندانی خدمت کے بے شمار پہلو — یہ سب ایسے اعمال ہیں جو ہر شخص کے حصے میں نہیں آتے۔

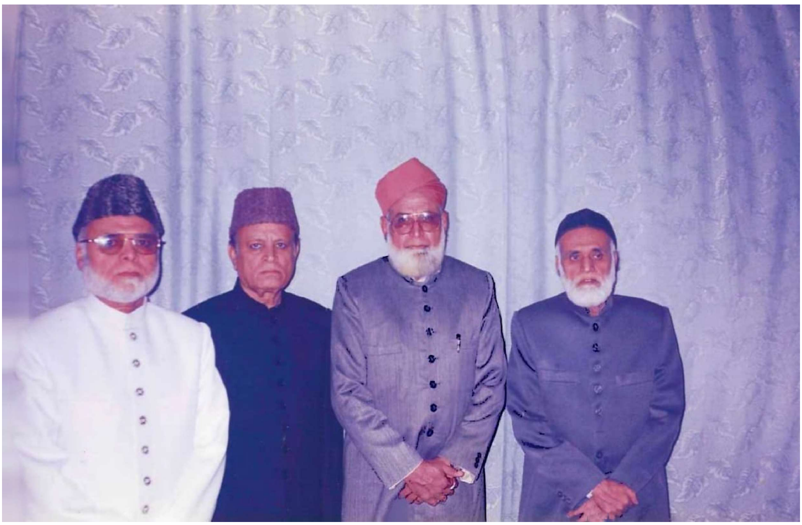


محترم والد صاحب کے دستِ مبارک سے تحریر کیا ہوا قرآن کریم کا نسخہ

یہ محض انسانی کوشش یا دنیاوی کامیابی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت، انتخاب، اور فضلِ ربانی کی ایک روشن مثال تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو اپنی رحمت، خیر اور خدمتِ دین کے لیے منتخب فرما لیتا ہے تو اُس کی زندگی کو محض ذاتی مفادات تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ اُسے دوسروں کے لیے آسانی، روشنی، علم، عبادت اور خیر کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔حضرت والدِ گرامی کی زندگی یقیناً اسی فضلِ الٰہی، اسی توفیقِ ربانی، اور اسی رحمتِ خداوندی کا ایک روشن اور قابلِ رشک نمونہ ہے۔

تاریخ کے روشن یادیں









حمایتِ حیات کی رحلت

سنہ۲۰۱۴ء میں ایک نہایت صدمہ انگیز خبر نے خاندان کو گہرے رنج والم میں مبتلا کردیا، جب حضرت والدِ گرامی کے نہایت مشفق، محسن، خیرخواہ اور قابلِ احترام چچا، جناب حمایت المقیت صدیقی صاحب اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ خاندان کی اُن بزرگ اور باوقار شخصیات میں شمار ہوتے تھے جن کی ذات محبت، سخاوت، خلوص، وسیع الظرفی اور خاموش احسانات کا ایک روشن استعارہ تھی۔ حضرت والدِ محترم کی زندگی کے نہایت اہم اور نازک ادوار میں اُنہوں نے جس اخلاص، شفقت اور سرپرستانہ محبت کا مظاہرہ فرمایا، وہ ہمیشہ ناقابلِ فراموش رہے گا۔ خصوصاً حضرت والدِ گرامی کے ابتدائی عملی سفر، سعودی عرب جانے کے مواقع، حج کی سعادت، اور بعدازاں جدہ میں مستقل قیام و ملازمت کے مراحل میں جناب حمایت المقیت صاحب نے نہ صرف مالی و عملی تعاون فرمایا بلکہ ایک ایسے مخلص سرپرست، خیرخواہ بزرگ اور حوصلہ افزا شخصیت کا کردار ادا کیا جس نے حضرت والدِ محترم کے مستقبل کی بنیادوں کو استحکام بخشنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اُن کی فراخ دلی، خاندانی محبت، اور دوسروں کو سہارا دینے کی عادت خاندان بھر میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔

حضرت والدِ گرامی اُن کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے اور ہمیشہ اُن کے احسانات، دعاؤں اور شفقت کو نہایت عقیدت اور ممنونیت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ اُن کے وصال نے گویا خاندان سے ایک ایسی بزرگ، سایہ دار اور خیر خواہ شخصیت کو جدا کر دیا جس کی موجودگی خود ایک قلبی اطمینان اور برکت کا احساس دلاتی تھی۔

اور پھر ابھی اس صدمے کی کیفیت پوری طرح کم بھی نہ ہوئی تھی کہ چند ہی مہینوں بعد محترم مبشر بھائی کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا تشخیص کیے گئے، جس نے ایک مرتبہ پھر پورے خاندان کو اضطراب، دعا اور غم کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ یہ وہی مبشر بھائی تھے جو حضرت والدِ گرامی کے نہایت قریب، محبوب اور وفادار سہاروں میں شمار ہوتے تھے۔ چونکہ میں اپنی ملازمت اور دیگر مصروفیات کے سبب دوسرے شہر منتقل ہو چکا تھا، اس لیے حضرت والدِ محترم کی روزمرہ ضروریات، ملاقاتوں اور جذباتی رفاقت میں مبشر بھائی کا کردار نہایت اہم ہو چکا تھا۔

طویل علاج، جسمانی تکلیفوں اور شدید بیماری کے بعد جب مبشر بھائی اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ سانحہ نہ صرف خاندان بلکہ حضرت والدِ گرامی اور میرے لیے بھی ایک عظیم جذباتی خلا چھوڑ گیا۔ گویا اُن کی اور میری زندگی کا ایک اور وفادار سایہ اچانک اُن سے جدا ہو گیا۔

اس اجالے دن میں یہ کیسی اندھیری آ گئی
بھائی تم کو اچانک یہ کیسے نیند آ گئی
وقت کے ہلچل میں یہ عجب گرہن لگ گیا
بس کھڑے ہی رہے تھے اور منزلِ زندگی آ گئی

یہ کیسے سو گئے بھائی کہ ہم سے رخ پھیر لیا
چھوڑ کر ہمارا ساتھ تم نے ویرانی کو چن لیا
سوتے تو ہم بھی ہیں پر اٹھتے مقدر سے بھی ہیں
تمہاری نیند نے تو نہ اٹھنے کا ارادہ ہی کر لیا

کیسے اکیلا اس دنیا میں ہمیں چھوڑ گئے تم
دھاگے مضبوط رشتوں کے سارے توڑ گئے تم
ابھی باتیں بہت تھیں کہنی اور سننی تم سے
باتوں باتوں میں یہ کیا بھائی منہ اپنا موڑ گئے تم

راز کی باتیں میں اپنے اب بتاؤں کسے
دکھڑا اپنا اور دل کے رنج کو میں سناؤں کسے
ہم راز ہم خیال ہم درد مبشر بھائی میرے
تمہاری جگہ پر کوئی دوسرا ساتھی اب بناوں کسے

غروب ہوتے آفتابِ رشتے کو میں دیکھتے رہ گیا
روتے ہوئے میرا دل ہی جیسے آنسوؤں میں بہہ گیا
کیسے بتاؤں جدائی کا یہ صدمہ کتنا زخمی کر دیا
ہوکر مجبور بے بس میں قدرت کے اس ستم کو سہہ گیا

ہائے !! میں صبر کے دامن کو سنبھالوں کیسے
دردِ جدائی کی تکلیف میں ،ہوش سنبھالوں کیسے
ہر قدم پر تمہاری آہٹ محسوس ہوتی ہے مجھے
خیالوں میں آتے تمہارے منظر سے نظر ہٹاؤں کیسے

آج خوشیوں کی زندگی تو ہے رلانے والی کل موت
ہر سانس سے تو ویسے ہی ہو رہے ہیں ہم قرب الموت
تمہاری رحلت نے یاد دلایا ہمیں بھی مرنا ہے کل
فرمانِ حق بیشک ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت

آزمائشوں کا سلسلہ

پھر سنہ ۲۰۱۵ء میں میں نے اپنی ملازمت سے کچھ عرصے کے لیے وقفہ لیا، تاکہ والدین کے ساتھ وقت گزار سکوں۔ انہی ایام میں محترمہ والدہ ماجدہ کی صحت غیر معمولی طور پر متاثر ہونے لگی۔ مختلف معالجین سے رجوع کیا گیا، علاج کی کوششیں ہوئیں، دعائیں کی گئیں، لیکن بالآخر یہ اندوہناک حقیقت سامنے آئی کہ وہ بھی کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو چکی ہیں۔

یہ خبر گویا پورے گھر پر بجلی بن کر گری۔ وہ ہستی، جو بیتِ عزیز کی روح، حضرت والدِ گرامی کی رفیقۂ حیات، اولاد کی تربیت کا مرکز، اور گھر کی محبتوں کا اصل محور تھیں، اب شدید بیماری کے بستر پر تھیں۔ گھر کی فضائیں، جو کبھی اُن کی مسکراہٹ، نظم، دعاؤں اور شفقت سے آباد رہتی تھیں، اب خاموش دعاؤں اور آنسوؤں سے بوجھل ہونے لگیں۔

حضرت والدِ گرامی کے لیے یہ آزمائش شاید اُن کی زندگی کی شدید ترین قلبی تکلیفوں میں سے ایک تھی۔ جس ہستی نے نصف صدی سے زائد عرصہ اُن کا ساتھ نبھایا، اُن کے دکھ سکھ کی ساتھی رہیں، پردیس کی مشقتوں سے لے کر بڑھاپے کی تنہائیوں تک ہر مرحلے میں اُن کے شانہ

بشانہ کھڑی رہیں—اب اُن کی جدائی کا تصور ہی حضرت والدِ محترم کے قلب کو لرزا دیتا تھا۔لیکن تقدیر اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔سنہ ۲۰۱۵ء میں محترمہ والدہ ماجدہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ**



ماں کی نظرِ اُلفت کے آغوش میں تھے میرے ہر قدم
وہ نگاہِ مبارک سے ہوئی محروم قسمت، اب ہر قدم
ہر قدم سائیاں تھی ممتا، کانٹوں کی دھوپ پر
تپشِ غم سے تڑپتا ہوں میں آج ہر قدم
ہر قدم لڑکھڑاتے ہیں میرے، بن دعاوں کے اب
گرتے ہوئے آتی ہے یاد وہ سمبھالتی اُنگلی ہر قدم
ہر قدم حکم و نصیحت پر اُن کے، جنت تھی منزل
رہنما کے بنا صرف ٹھوکر ہیں راہ پر اب ہر قدم
دم بدم ہو نزولِ رحمت، لحدِ مبارک آپکی نور سے منور،
بس یہ دعا مری ہو فردوس کے آنگن میں آپکے ہر قدم







محترمہ والدہ ماجدہ کے وصال نے بیتِ عزیز کی فضاؤں سے گویا سکون، نظم اور مادری محبت کی وہ روشنی چھین لی جو برسوں سے اس گھر کو منور کیے ہوئے تھی۔ حضرت والدِ گرامی اگرچہ صبر، تحمل اور رضا بالقضا کے پیکر تھے، لیکن اس مرتبہ اُن کے دل پر ایسا زخم لگا جس کی گہرائی کو صرف ایک

وفادار شریکِ حیات کی جدائی سمجھنے والا ہی محسوس کرسکتا ہے۔ گھر کے ہر گوشے میں اُن کی یاد موجود تھی، ہر معمول اُن کی موجودگی کا احساس دلاتا تھا، اور ہر خاموش لمحہ اُن کے فراق کی گواہی دیتا تھا۔ حضرت والدِ گرامی کی آنکھوں میں اُس وقت جو خاموش غم، تنہائی اور بے آواز شکستگی محسوس ہوتی تھی، وہ الفاظ سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔



پھر آزمائشوں کا سلسلہ یہیں نہ رکا۔ سنہ ۲۰۱۶ء میں میری ہمشیرہ کی طلاق کا واقعہ بھی گھر کے لیے ایک نہایت تکلیف دہ مرحلہ ثابت ہوا۔ اس سانحے نے حضرت والدِ گرامی کے قلب کو مزید غمگین کردیا، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنی اولاد کی خوشیوں اور استحکام کے لیے دعاگو رہتے تھے۔

رات بھی اندھیری ، میرے نصیب کا سورج بھی ڈوب گیا
اُمید چاندنی سے تھی پر بادلوں میں چاند بھی چھُپ گیا
تاریکی میں کھائے اتنے ٹھوکر کہ بکھر گیا مقصدِ حیات
لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے سایے کا سہارا بھی چھوٹ گیا
کانٹوں کی راہ سے گزر کر ، تلخیوں کے طوفان میں
ٹوٹ گیا وجود، ارادوں کا میرا آینہ بھی پھوٹ گیا
گزر گئی ایک مدّت انتظار میں اُس چمکتے سورج کے
نہ جانے کیا خطا ہوئی کہ زندگی سے اُجالا بھی روٹھ گیا

سنہ ۲۰۱۷ء میں حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے برادرِ محترم ،(جناب فاروق تایا صاحب) بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ بھائی، جو بچپن سے اُن کے سر پرست، رہنما، محسن اور زندگی کے ہر موڑ پر مضبوط سہارا رہے تھے، اب اس دنیا میں موجود نہ رہے۔ یہ جدائی حضرت والدِ محترم کے لیے ماضی کے پورے عہد کے اختتام کی مانند تھی۔ لیکن قدرت ہمیشہ غم کے ساتھ رحمت کے دروازے بھی کھولتی ہے۔ اُسی سال اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک صاحبزادے ابوالحسن حنین حفیظ صدیقی کی نعمت عطا فرمائی، جس کی آمد نے گھر کے ماحول میں ایک نئی خوشی پیدا کر دی۔ حضرت والدِ گرامی نے اپنے پوتے کو بے حد محبت اور شفقت سے نوازا۔

بعد ازاں سنہ ۲۰۱۸ء میں حضرت والدِ محترم کے دوسرے بڑے بھائی (جناب معظم تایا صاحب) اور اُن کی نہایت محبّ بہن (جو کہ میرے والدِ محترم کی سمدھن بھی تھیں) بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوں اُن کی زندگی کے وہ تمام قریبی رشتے، جن کے ساتھ اُنہوں نے بچپن، جوانی، آزمائشیں، خوشیاں اور جدوجہد کے طویل ادوار گزارے تھے، رفتہ رفتہ پردۂ اجل میں پوشیدہ ہوتے چلے گئے۔

وہ شام کی رونق، تاریخ کے خزانوں میں کھو گئی
نیند یادوں کی، تاریک نگاہوں میں سو گئی
در و دیوار، محل و دالان میں، شور ہے باقی
گونج آوازوں کی، ویران کمانوں میں کھو گئی
دستک دیوان میں اور احساسِ آہٹ ہے باقی
وجود کی داستان، بے جاں فضاؤں میں کھو گئی
شامِ خزاں ہے چھائی، بس ایک روشن نسب ہے باقی
چاندنی چراغوں کی، جدائی کے ستاروں میں کھو گئی
تکلّفِ رنج کا رعب ہے اب زندگی میں باقی
کفالتِ اجداد کی شمع، تنہائی کے اجالوں میں کھو گئی

سنہ ۲۰۲۰ء میں اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر ہمیں بیٹی کی نعمت عطا فرمائی، جس کا نام میری والدہ کے اسمِ گرامی پر رکھا گیا، لائق زینت حورعین صدیقہ۔ اسی سال اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی سعودی عرب میں ملازمت کا موقع عطا فرمایا۔

چاند تھا چاندنی تھی اور جگمگاتے ستارے بھی تھے،
عروسہ کی مسکان کے خوشنما نظارے بھی تھے،
موج ورواں کے لہروں میں صدف کے خزانے بھی تھے،
شرارتوں کے ترنم میں حنین کے ترانے بھی تھے،
برکت کے نزول پر نشاطِ رحمت کی ندا تھی باقی،
بشارتِ بہشت کی نورانی شمع تھی باقی،
رونق کی صدا تھی باقی ،ایک خوبصورت دعا تھی باقی،
نازوں کی ادا تھی باقی، حورعین کی عطا تھی باقی۔

پھر اسی سال والد محترم کے سمدھی جو کہ ان کے بہنوائی تھے، جناب قاضی محمد حسین صدیقی صاحب، المعاروف قادر پاشاہ صاحب (میرے پھوپھا حضرت اور میرے سسر صاحب)، کووید کی وجہ سے اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئے۔

خاندانِ صدیق کا ستونِ ایوان ٹوٹ گیا،
فانوسِ قضائت کا نگینہِ شان ٹوٹ گیا،
ٹوٹ گیا رحلتِ پاسبان سے پہرا نگہبان،
پہاڑِ حزن ٹوٹا ایسے، سرپرستی کا مکان ٹوٹ گیا۔

ذاتِ جناب کی معزز، باوقار، بےنظیر، صاحبِ جلال تھی،
خوش فعال، لاجواب، پربہا، بےمثال، ذاتِ جمال تھی،
مالک ظرفِ ظریف، خوش ذوق، خوش نما وخوش خصال تھی،
باوجودِ سادگی ،وجودِ اعلیٰ ،باادب بالحاظ، باکمال تھی۔

لحدِ مرحوم کو پرنور کر رحمتِ اکمل سے اے خدا،
کر نوازشِ کرم فردوسِ بریں کے فضل سے اے خدا،
اخلافِ ساکنِ بہشت کو صبر وتمکین عطا کر اے خدا،
اس جفا اِ جدائی پر تحملِ تسلسل عطا کر اے خدا۔

زندگی کے نئے مراحل

پھر سنہ ۲۰۲۱ء میں، زندگی کی مسلسل آزمائشوں اور غموں کے بعد، میں نے اپنے اہلِ خانہ اور حضرت والدِ گرامی کے لیے سعودی عرب کے سفر کا انتظام کیا تاکہ اُن کے دل و دماغ کو تازگی، سکون اور تبدیلی میسر آسکے۔ یہ سفر ایک نہایت جذباتی کیفیت کا حامل تھا، کیونکہ تقریباً بیس برس بعد حضرت والدِ محترم دوبارہ اُس سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے جہاں اُن کی جوانی، اُن کی جدوجہد، اُن کی کامیابیاں، اور اُن کی زندگی کی بے شمار حسین یادیں محفوظ تھیں۔

جب وہ دوبارہ جدہ کی فضاؤں میں داخل ہوئے تو گویا ماضی کی پوری دنیا اُن کی نگاہوں کے سامنے زندہ ہوگئی۔ پرانی یادیں، گزرے ہوئے ایام، مرحوم رفقاء، خاندانی لمحات، اور جوانی کی محنتیں سب ایک سیلاب کی مانند اُن کے ذہن و قلب میں اُمنڈنے لگیں۔ بعد ازاں سنہ ۲۰۲۳ء میں ایک مرتبہ پھر مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ میں اپنے اہلِ خانہ اور حضرت والدِ گرامی کو عمرے کے لیے سعودی عرب لے جاؤں۔ یہ سفر نہایت روح پرور، خوشگوار اور قلبی سکون سے بھرپور ثابت ہوا۔ حرمین شریفین کی حاضری، اہلِ خانہ کی رفاقت، اور حضرت والدِ محترم کے چہرے پر نمایاں روحانی اطمینان اُس سفر کی سب سے حسین یادوں میں شامل ہیں۔

اس یادگار سفرِ سعودی عرب کو خوشگوار، آرام دہ، اور یادگار بنانے میں نہایت مخلص اور خدمت گزار بھتیجے اور بھانجے نے قابلِ تحسین کردار ادا کیا۔ اُن دونوں کی محبت، مہمان نوازی، خدمت نے حضرت والدِ محترم کے دل میں ایک خاص روحانی سکون و قلبی مسرت پیدا کر دی۔

محترم سعود بھائی، جو حضرت والدِ گرامی کے سب سے بڑے بھتیجے ہیں اور طویل عرصے سے ملکِ عرب میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، اُنہوں نے حضرت والدِ محترم کی میزبانی اور خدمت میں غیر معمولی خلوص، محبت اور عقیدت کا مظاہرہ فرمایا۔ اُن کے لیے یہ محض ایک میزبانی نہ تھی بلکہ وہ اسے اپنے لیے ایک سعادت، اعزاز اور قلبی خوش نصیبی تصور کر رہے تھے کہ انہیں اپنے بزرگ چچا کی خدمت اور رفاقت کا موقع حاصل ہوا۔



محترم سعود بھائی نے حضرت والدِ گرامی کی رہائش، آرام، آمد و رفت، ملاقاتوں، اور دیگر تمام ضروریات کا نہایت محبت اور اہتمام کے ساتھ خیال رکھا تا کہ اُن کا یہ سفر ہر اعتبار سے خوشگوار، آرام دہ اور یادگار بن سکے۔

اسی طرح حضرت والدِ گرامی کے نہایت قابلِ ذکر بھانجے محترم ڈاکٹر عبدالوہاب فہد صدیقی صاحب، (جو میرے سالے بھی ہوتے ہیں)، نے بھی اس مبارک سفر کے دوران غیر معمولی خدمت، توجہ اور محبت کا مظاہرہ فرمایا۔ وہ حضرت والدِ محترم کی محبّ ہمشیرہ کے دوسرے صاحبزادے ہیں اور خاندان کے سب سے چھوٹے بھانجے میں شمار ہوتے ہیں۔

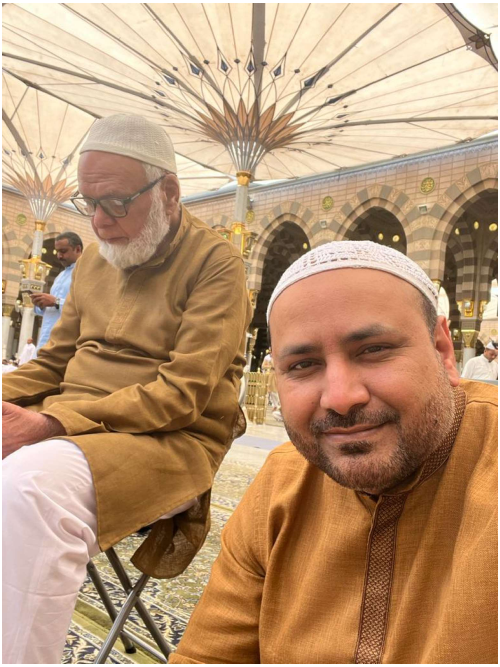


ڈاکٹر فہد بھائی گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے سرزمینِ عرب میں مقیم ہیں اور اپنی ذہانت، قابلیت، مسلسل محنت، اور پیشہ ورانہ مہارت کے باعث نہایت کم عرصے میں نمایاں ترقی اور بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اُن کی شخصیت میں جدید فکری وسعت، پیشہ ورانہ ذہانت، انتظامی صلاحیت، اور خاندانی وابستگی کا نہایت خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

وہ نہایت ذہین، فعال، باصلاحیت، اور کثیر الجہات شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ اُن کی طبیعت میں حاضر دماغی، معاملہ فہمی، اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنے کی خاص صلاحیت موجود ہے، جس نے انہیں نہ صرف پیشہ ورانہ میدان میں کامیابی عطا کی بلکہ خاندانی وسماجی تعلقات میں بھی ایک ممتاز مقام بخشا۔

حضرت والدِ گرامی کے مکہ اور مدینہ کے مبارک سفر کے دوران ڈاکٹر فہد بھائی نے نہایت انہماک، محبت اور عقیدت کے ساتھ اپنا قیمتی وقت حضرت والدِ محترم کی خدمت اور رفاقت کے لیے مخصوص رکھا۔ اُنہوں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ حضرت والدِ گرامی کو سفر کے دوران کسی قسم کی دشواری، تکلیف یا پریشانی محسوس نہ ہو، اور وہ مکمل سکون واطمینان کے ساتھ مقدس مقامات کی حاضری اور روحانی لمحات سے لطف اندوز ہو سکیں۔

درحقیقت حضرت والدِ گرامی کے یہ بھتیجے اور بھانجے اُس تربیت، محبت اور خاندانی روایات کا روشن عکس ہیں جو خاندان کے بزرگوں نے اپنی نسلوں میں منتقل کیں۔ اُن کی خدمت، احترام، مہمان نوازی اور عقیدت نے یہ واضح کردیا کہ خاندان کی نئی نسل نہ صرف اپنے بزرگوں سے محبت کرتی ہے بلکہ اُن کی عزت و خدمت کو اپنی سعادت اور ذمہ داری سمجھتی ہے۔



یوں سعودی عرب کے یہ دونوں سفر صرف روحانی اعتبار سے ہی یادگار نہ رہے بلکہ خاندان کی نئی نسل کی محبت، وفاداری، اور خدمت کے جذبے کی ایک نہایت خوبصورت اور قلب کو متاثر کرنے والی مثال بھی بن گئے۔

اُن ایام میں جب راقمِ سطور سعودی عربیہ میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھا، حضرت والدِ گرامی کی روزمرہ دیکھ بھال، قلبی رفاقت اور مختلف ضروریات میں آپ کے ایک اور بھتیجے، مضبوط سہارا بن کر ہمیشہ پیشِ خدمت رہتے۔ انہی باوفا اور محبت کرنے والی شخصیات میں، محترم محمد مکرم الحق صدیقی صاحب، نہایت نمایاں مقام رکھتے ہیں، جو حضرت والدِ گرامی کے دوسرے بڑے بھائی (معظم تایا صاحب) کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔

محترم مکرم بھائی نے اپنے والدِ محترم کی طرح محبت، خلوص، خدمت اور بزرگوں کے احترام کی اعلیٰ روایات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی شخصیت کا حصہ بنایا۔ اُن کی طبیعت میں نرم دلی، اپنائیت، خاندانی وابستگی اور خدمت کا ایسا جذبہ پایا جاتا ہے جو اُنہیں خاندان کے ہر فرد کے لیے باعثِ اعتماد بناتا ہے۔ خصوصاً حضرت والدِ گرامی کے ساتھ اُن کا تعلق نہایت احترام، محبت اور قلبی وابستگی پر مبنی رہا۔

حضرت والدِ محترم جب بھی اُنہیں یاد فرماتے، کسی ضرورت کا اظہار کرتے، یا محض رفاقت و گفتگو کے خواہش مند ہوتے، محترم مکرم بھائی بلا تردد اور نہایت خلوص کے ساتھ حاضر ہو جاتے۔ اُن کی یہ کیفیت محض رسمی تعلق یا خاندانی فرض کی ادائیگی نہ تھی بلکہ ایک حقیقی قلبی محبت، تربیت یافتہ ادب، اور بزرگوں کے ساتھ روحانی وابستگی کا حسین اظہار تھی۔

محترم مکرم بھائی حضرت والدِ گرامی کے لیے نہ صرف ایک معاون شخصیت تھے بلکہ اُن کے بڑھاپے کے ایام میں ایک ایسی مانوس رفاقت، سکون بخش موجودگی، اور گرم جوش صحبت کا ذریعہ بھی بنے جس نے اُن کی زندگی کے تنہائی آمیز لمحات کو محبت اور اپنائیت سے بھر دیا۔ اُن کی گفتگو، اُن کی آمد ورفت، اور اُن کی توجہ حضرت والدِ محترم کے لیے ایک قلبی اطمینان کا سبب بنتی تھی۔

درحقیقت حضرت والدِ گرامی ہمیشہ اپنے تمام بھتیجوں اور بھانجوں پر فخر محسوس فرمایا کرتے تھے۔ وہ اکثر اس بات کا اظہار کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایسی نسل عطا فرمائی ہے جو اپنے بزرگوں کی عزت، خدمت اور محبت کو محض روایت نہیں بلکہ عملی ذمہ داری سمجھتی ہے۔ اُن کے تمام بھتیجے اور بھانجے واقعی خاندان کے وہ قیمتی جواہرات ثابت ہوئے جنہوں نے اپنے کردار، اخلاق، ادب اور خدمت کے ذریعے بزرگوں کی تربیت اور خاندانی اقدار کی سچائی کو ثابت کیا۔

یہ سب اُس تربیت، محبت اور خاندانی تہذیب کا نتیجہ تھا جو حضرت والدِ گرامی کے برادرانِ اکابر نے اپنی اولاد میں منتقل کی تھی۔ بزرگوں کے احترام، اُن کی خدمت، اُن کی ضروریات کا خیال، اور اُن کے ساتھ محبت و وفاداری کے جذبات اُن نوجوانوں کے کردار کا مستقل حصہ بن چکے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ وقتِ ضرورت وہ سب حضرت والدِ گرامی کے لیے مضبوط سہاروں کی صورت سامنے آئے۔



محترم مکرم بھائی خصوصاً حضرت والدِ محترم کے لیے اُسی طرح قلبی سکون، محبت بھری رفاقت اور خدمت کا ذریعہ بنے جیسے اُن کے چھوٹے بھائی، مرحوم مبشر بھائی، اپنی زندگی میں حضرت والدِ گرامی کے نہایت قریب اور محبوب ساتھی رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والدِ گرامی کی زندگی میں محبت کرنے والے، ادب و وفا نبھانے والے، اور خدمت کے جذبے سے سرشار بھتیجوں کی صورت ایسے مضبوط ہاتھ عطا فرمائے جو اُن کے بڑھاپے کی تنہائیوں، کمزوریوں اور ضرورتوں میں اُن کے لیے رحمت، سہارا اور سکون بن گئے۔

بیٹی کا کردار

زندگی کے تلخ تجربات کے ساتھ جب میری ہمشیرہ کی علیحدگی واقع ہوئی، تو اگرچہ یہ مرحلہ جذباتی اعتبار سے نہایت کٹھن اور غمگین تھا، لیکن انہوں نے اس صورتحال کو مایوسی، شکوے یا شکست خوردگی کے بجائے صبر، وقار اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر یقین کے ساتھ قبول کیا۔ آج وہ ہمارے ساتھ مقیم ہیں اور حضرت والدِ گرامی کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے جس خاموش محبت، ایثار اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں، وہ یقیناً قابلِ تحسین اور باعثِ احترام ہے۔ اُنہوں نے خود کو محض ایک بیٹی کے محدود کردار تک محصور نہیں رکھا بلکہ بڑھاپے کی دہلیز پر موجود اپنے والد کے لیے ایک مخلص خدمت گزار کا ذریعہ بن کر زندگی بسر کر رہی ہیں۔ حضرت والدِ محترم کی روزمرہ ضروریات، صحت، آرام، خوراک، اور جذباتی اطمینان کا وہ نہایت باریک بینی، محبت اور توجہ کے ساتھ خیال رکھتی ہیں۔ اُن کی طبیعت میں خدمت کا جذبہ تصنع یا نمود سے پاک ہے۔ وہ خاموشی سے، بغیر کسی اظہار یا توقع کے، اپنے فرائض کو ایسی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ انجام دیتی ہیں کہ گھر کا ماحول اُن کی موجودگی سے سکون، ترتیب اور اپنائیت کا احساس دیتا ہے۔

اُن کی شخصیت میں نہایت سادگی، خاکساری اور منکسرالمزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ طبیعتاً نرم خو، وسیع القلب، بردبار اور انتہائی شائستہ خاتون ہیں۔ باوجود اس کے کہ زندگی نے اُنہیں بعض جذباتی صدمات سے گزارا، اُن کے مزاج میں تلخی، شکایت یا سختی پیدا نہ ہوسکی۔ بلکہ اُن کی شخصیت میں ایک ایسی پختگی، تحمل اور وسعتِ ظرف پیدا ہوگئی جو ہر ملنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ خاندانی وقار اور تربیت کے باوجود اُن کے مزاج میں غرور، خودنمائی یا بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ وہ ہر فرد کے ساتھ محبت، خلوص اور عزت کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ اُن کی گفتگو میں نرمی، انداز میں شائستگی، اور رویّے میں ایسا اپنائیت بھرا وقار پایا جاتا ہے جو دلوں میں احترام پیدا کرتا ہے۔

حضرت والدِ گرامی کے ساتھ اُن کی وابستگی محض فرض کی ادائیگی نہیں بلکہ قلبی محبت، روحانی عقیدت اور جذباتی قربت کا ایک حسین اظہار ہے۔ وہ اپنے والد کی تنہائی، اُن کی بڑھتی عمر، اُن کی کمزوریوں اور اُن کے جذبات کو نہایت حساسیت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں، اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ اُن کی زندگی کے اس آخری دور میں انہیں کسی قسم کی کمی، بے توجہی یا تنہائی کا احساس نہ ہو۔

درحقیقت اُن کی خدمت، محبت اور خاموش قربانیوں میں محترمہ والدہ ماجدہ کی تربیت، خاندانی اقدار، اور حضرت والدِ گرامی کی عمر بھر کی اخلاقی تعلیمات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اُن

خواتین میں سے ہیں جو اپنی آزمائشوں کو اپنی شخصیت کی شکست نہیں بناتیں بلکہ اُنہیں صبر، خدمت، وقار اور روحانی پختگی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

آج جب حضرت والدِ گرامی عمر کے اُس مرحلے میں ہیں جہاں اولاد کی توجہ، محبت اور قربت سب سے بڑی نعمت بن جاتی ہے، تو اُن کی یہ صاحبزادی اُن کے لیے واقعی ایک رحمت، ایک سہارا، اور ایک خاموش سکون کی صورت بن چکی ہیں۔ اُن کی خدمت، اُن کی عاجزی، اور اُن کی بے لوث وابستگی یقیناً اُن اوصاف میں سے ہے جو نہ صرف خاندان بلکہ ہر صاحبِ شعور کے دل میں اُن کے لیے عزت اور دعا کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

کاروانِ حیات ابھی رواں ہے

حضرت محمد منظور الحق صدیقی صاحب کے شجرہ حیات کی وہ کونپل، جو ایک زمانے میں آزمائشوں، محرومیوں، جدوجہد اور صبر کے موسموں سے گزر کر پروان چڑھی تھی، آج ایک تناور اور سایہ دار درخت کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اُس درخت کی شاخوں پر محبت کے پھول کھل چکے ہیں، اُس کی جڑیں خاندانی اقدار کی گہرائیوں میں مضبوطی سے پیوست ہو چکی ہیں، اور اُس کی خوشبو نسل در نسل اخلاص، محبت، ادب، خدمت اور خاندانی وفاداری کی صورت میں پھیل رہی ہے۔

وقت کا دریا اپنی روانی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے گا، نسلیں بدلتی رہیں گی، چہرے تبدیل ہوتے رہیں گے، اور زندگی کے قافلے نئے مسافروں کے ساتھ سفر جاری رکھیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر نسل اپنی شناخت اپنی جڑوں سے حاصل کرتی ہے۔ وہی خاندان دیرپا عزت و وقار حاصل کرتے ہیں جو اپنے بزرگوں کی روایات، اپنی تہذیبی بنیادوں، اور اپنے اخلاقی ورثے کو محفوظ رکھتے ہیں۔ درخت کی شاخیں خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو جائیں، اُن کی قوت اور بقا ہمیشہ اُن جڑوں سے وابستہ رہتی ہے جنھوں نے اُنھیں زندگی بخشی ہوتی ہے۔

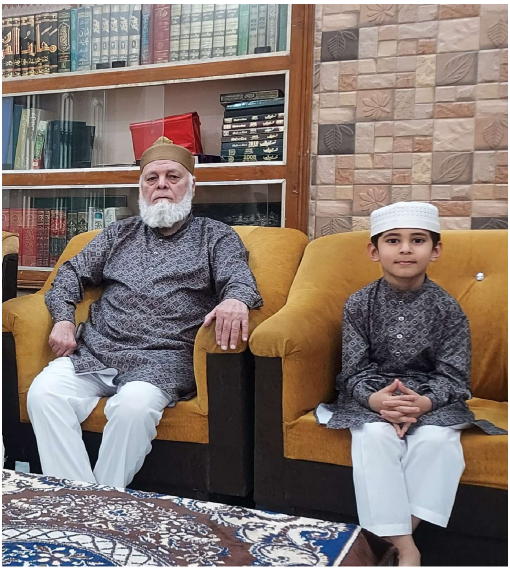
حضرت والدِ گرامی کی پوری زندگی دراصل اسی فلسفہ حیات کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے کردار، اپنے طرزِ عمل، اپنی سوچ، اپنی گفتگو، اپنی ذہانت، اپنی دوراندیشی، اور اپنے طرزِ زندگی سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی اصل کامیابی دولت، منصب یا شہرت کے انبار میں نہیں بلکہ نظم وضبط، اخلاق، خاندانی وابستگی، اور انسانیت کے ساتھ حسنِ سلوک میں مضمر ہے۔

اُن کی زندگی کا ہر باب اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ محبت انسان کو جوڑتی ہے، رشتے انسان کو مضبوط بناتے ہیں، اور خدمتِ خلق انسان کے وجود کو بامعنی بناتی ہے۔ انسان اگر اپنے اردگرد محبت، احترام اور خیرخواہی کا ماحول پیدا کرے تو اُس کا نام اُس کے بعد بھی دلوں میں زندہ رہتا ہے، لیکن جو لوگ اپنی زندگی کو غرور، بے ترتیبی، خودغرضی اور دوسروں کے لیے تکلیف کا سبب بنا دیتے ہیں، وہ وقت کی گرد میں گم ہو جاتے ہیں اور اُن کے جانے کے بعد معاشرہ اُنھیں یاد کرنے کے بجائے اُن کی عدم موجودگی کو سکون سمجھتا ہے۔

حضرت والدِ گرامی نے اپنی پوری زندگی کے ذریعے آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیا کہ ایک منظّم شخصیت، ایک مہذب کردار، ایک باوقار طرزِ حیات، اور ایک اصول پسند زندگی ہی حقیقی کامیابی کی معراج ہے۔ اُنھوں نے یہ سبق محض الفاظ میں نہیں دیا بلکہ اپنی عملی زندگی کے ہر مرحلے میں اُسے جیا، ثابت کیا، اور اپنی اولاد و احفاد کے لیے ایک زندہ نمونہ بنا کر چھوڑا۔

اگر اُن کی حیات کا خلاصہ چند الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ صبر میں استقامت، تعلقات میں وفاداری، کردار میں وقار، خدمت میں اخلاص، اور زندگی میں نظم و ضبط کا ایک روشن استعارہ ہے۔ یہی وہ سرمایہ ہے جو نہ جائیدادوں سے حاصل ہوتا ہے، نہ منصبوں سے، اور نہ ہی وقتی شہرت سے۔

آج جب ہم حضرت والدِ گرامی کی حیاتِ مبارکہ کے اوراق سمیٹتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ داستان دراصل ایک ایسے انسان کی روداد ہے جس نے زندگی کے شدید ترین طوفانوں میں بھی اپنے اصولوں، اپنے صبر، اپنے خاندانی وقار، اور اپنے ایمان کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔



آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت والدِ گرامی عمرِ عزیز کی آٹھویں دہائی میں بھی نسبتاً اچھی صحت اور روحانی سکون کے ساتھ شانِ وقار سے جلوہ افروز ہیں۔ اگرچہ بڑھاپے کی فطری کمزوریاں اُن کے جسم پر اثر انداز ہورہی ہیں، لیکن اُن کا قلب آج بھی نماز، تلاوتِ قرآن، ذکرِ الٰہی، اور خاندان کی محبتوں سے منور ہے۔ اُن کی موجودگی آج بھی ہمارے لیے دعا، برکت، تربیت اور قلبی سکون کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت والدِ گرامی کو صحتِ کاملہ، عافیت، سکونِ قلب، طویل و بابرکت عمر، ایمان کی سلامتی، اور اپنی خصوصی رحمتوں سے ہمیشہ مالا مال فرمائے۔ اُن کے قائم کردہ دینی، اخلاقی، خاندانی اور رفاہی ورثے کو تا قیامت جاری وساری رکھے، اُن کی نسلوں میں محبت، اتحاد، خیر اور برکت قائم رکھے، اور اُن کی حیات و خدمات کو دنیا و آخرت میں باعثِ عزت ونجات بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

اس طرح یہ سوانح درخشاں اب اختتام پر آ گیا، پر سلسلہِ محبت و کشمکش زندگی کے مراحل میں رواں دواں رہے گا......

معذرت خواہی

اس سرگزشتِ حیات کی اس طویل داستان کو قلمبند کرتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حافظہ، تحریری حدود، اور واقعات کے بے شمار تسلسل کے باوجود ہر اُس شخصیت، ہر اُس رشتے، اور ہر اُس واقعے کو مکمل طور پر اس کتاب میں سمو دینا ممکن نہ ہو سکا جو حضرت والدِ گرامی کی زندگی یا ہمارے خاندانی حلقہِ تعلقات کا حصہ رہے۔ چنانچہ اگر کسی معزز رشتہ دار، قریبی عزیز، مخلص دوست، یا خاندان کے کسی محترم فرد کا ذکرِ خیر اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ نہ آ سکا، یا اُن کے تعارف، خدمات، محبتوں اور وابستگیوں کو وہ مقام نہ دیا جا سکا جس کے وہ حقیقتاً مستحق تھے، تو اس کو ہرگز بے اعتنائی، فراموشی یا اہمیت میں کمی پر محمول نہ کیا جائے۔

درحقیقت اس کتاب میں اُنہی واقعات، شخصیات اور ابوابِ حیات کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حضرت والدِ گرامی کی زندگی کے بنیادی، فیصلہ کن اور نمایاں مراحل سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ اس دوران بے شمار ایسے واقعات، یادیں، تعلقات اور شخصیات

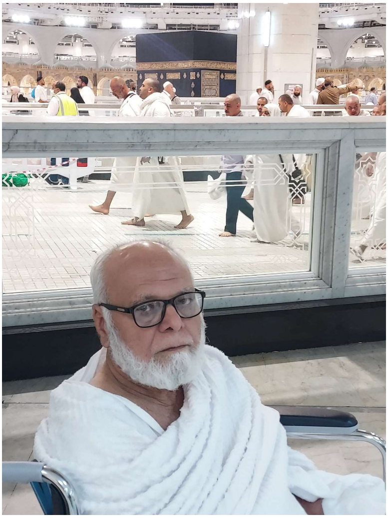
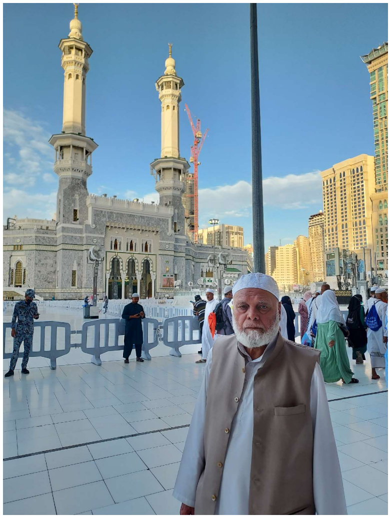
بھی یقیناً رہ گئیں جو اپنی جگہ نہایت اہم اور قابلِ قدر تھیں، مگر یا تو اختصارِ تحریر کے تقاضے آڑے آ گئے، یا وقت کے طویل فاصلے نے بعض یادوں کو دھندلا دیا۔

لہٰذا اس کتاب کے راقم کی جانب سے تمام معزز اہلِ خاندان، عزیز و اقارب، قریبی احباب، اور اُن تمام محترم شخصیات کی خدمت میں نہایت ادب، عاجزی اور خلوص کے ساتھ معذرت پیش کی جاتی ہے جن کا ذکر اس تحریر میں نہ آ سکا یا جن کے احسانات، تعلقات اور محبتوں کو مکمل طور پر قلمبند نہ کیا جا سکا۔ یقیناً وہ سب ہمارے دلوں میں احترام، محبت اور دعا کے ساتھ ہمیشہ زندہ ہیں، اگرچہ الفاظ اُن کے حق کو مکمل طور پر ادا نہ کر سکے۔

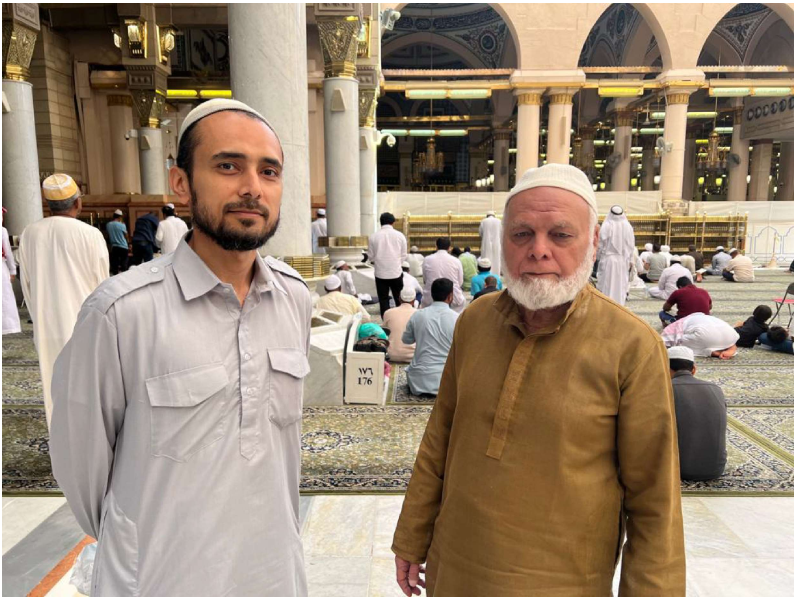
محترم جناب محمد منظور الحق صدیقی و محترمہ رحمٰن بیگم (زوجہ اولیٰ)

- ۱۔فضل محمد حبیب الرحمٰن صدیقی المعاروف فاروق صدیقی
  زواج با، رحمت النساء بیگم
- ۲۔محمد مرغوب الحق صدیقی المعاروف معظم صدیقی
  زواج با، انور طاہرہ بیگم
- ۳۔محمد مظفر الحق صدیقی المعاروف ظفر صدیقی
- ۴۔قاضی محمد حفیظ الحسن صدیقی المعاروف شاھد صدیقی
  زواج با، لعیق زینت الاخلاق
  - ابوالخیر احمد عزیر حفیظ صدیقی
  - احمد مشاھد حفیظ صدیقی
    زواج با، رضوانہ فاطمہ نمیرہ صدیقہ
    - ام القریٰ عروسہ صدیقہ
    - قرۃ العین صدف صدیقہ
    - ابوالحسن حنین حفیظ صدیقی
    - لئیق زینت حورین صدیقہ
  - امتہ الرحمٰن شمیسہ صدیقہ
- ۵۔عصمت الاخلاق صدیقہ
- ۶۔نزہت فیوض صدیقہ
- ۷۔تنویر مسرت جہاں صدیقہ
  زوجہ جناب قاضی محمد حسین صدیقی المعاروف قادر پاشاہ صاحب
- ۸۔ابو مظہر صدیقی
- ۹۔اظہر اولیاء صدیقی



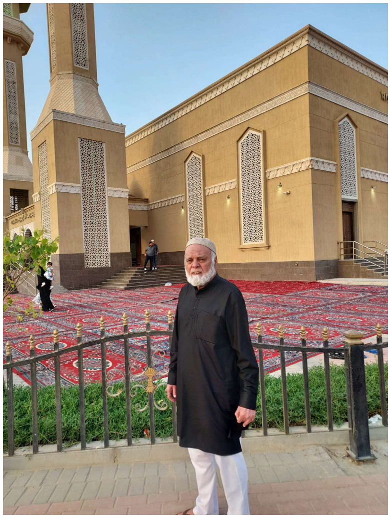






176








خروج
Way Out
8
مكة المكرمة
Makkah


ESQ